© rasailojaraid.com

اداریہ

نائب مدیر

پیغام سیرت

کام یاب زندگی

اسوۂ حسنہ کی روشنی میں چند گُر کی باتیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم، امابعد

کام یابی کیا ہے؟

دنیا میں آنے والے ہر انسان کو کام یابی کی تلاش ہوتی ہے، یہ کام یابی اس کو کس حد تک ملتی ہے، وہ اپنے آپ کو کسی حد تک کام یاب تصور کرتا ہے، اور کس حد تک مطمئن ہو کر دنیا سے رخصت ہوتا ہے، یہ الگ سوال ہے، ہمیں اس وقت تو صرف اس نکتے سے بحث مطلوب ہے کہ ہر انسان جب کام یابی کا متلاشی ہے تو وہ کام یابی اسے کیسے میسر آسکتی ہے؟ خاص طور پر سیرت طیبہ اور اسوۂ حسنہ کی روشنی میں۔

انسان کام یابی کی تلاش میں کئی پہلوؤں سے کوشش کرتا ہے، غور و فکر کے حوالے سے بھی، عملی اقدامات کے حوالے سے بھی، لیکن ہمیں اگر خاص اسلامی نقطۂ نظر سے کام یابی کی تلاش ہو اور قرآن و سنت کی روشنی میں ہم کام یابی کا تصور جاننا چاہیں تو ہمارے سامنے یہ نکتہ لازماً رہنا چاہیے کہ اسلام چوں کہ دین فطرت ہے، اس لیے وہ کسی فطری تقاضے کو ختم کرکے یا اس کو مٹا کر کام یابی کا تصور پیش نہیں کرتا، اور کام یابی کے لیے کسی بھی فطری جذبے اور تقاضے کی نفی کرنا ضروری نہیں ہے، انسان کی دنیاوی زندگی کا تعلق مادیت سے جڑا ہوا ہے، اس لیے اس مادیت کی مکمل طور پر نفی اسلام کا مطلوب ہو ہی نہیں ہو سکتی۔

اس مادیت کے دو مظاہر اور دو پہلو ہم یہاں پیش کرسکتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۔ پیسہ

۲۔ عہدہ اور منصب یا صلاحیت کے اظہار کی مختلف صورتیں

یہ حقیقت ہے کہ انسانی کام یابی کو ان دونوں باتوں سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا، نہ اس کے بارے میں کوئی رائے درست ہو سکتی ہے، جب تک وہ تمام فطری تقاضوں کو اس کا جائز مقام دے کر قائم نہ کی جائے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اس دنیا میں آنے والے کسی بھی شخص سے کہا جائے کہ وہ مادیت کے ان دونوں پہلوؤں سے مکمل طور پر لاتعلق ہو کر اپنی زندگی کو کام یاب بنا لے۔ اگر انسانی تاریخ میں یہ فکر اور فلسفہ پیش بھی کیا گیا تو وہ عملی طور پر چل نہیں سکا۔ فطرت کے خلاف کوئی صدا کبھی کام یاب نہیں ہو سکتی۔ اسلام نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو معاشی تگ و دو کو فرائض کے درجے کی چیز شمار کیا ہے۔ فرمایا:

طلب كسب الحلال فريضة بعد الفريضة[1]

حلال روزی کی تلاش دوسرے فرائض کے بعد ایک فریضہ ہی ہے۔

دوسرا معاملہ اظہار شخصیت و صلاحیت کا ہے، یہ مرحلہ عموماً منصب اور ذمے داریوں کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ بھی انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا اظہار مانگتی ہے، اور اظہار کا میدان مانگتی ہے۔ اب چوں کہ یہ انسانی فطرت ہے، انسانی مزاج کا حصہ ہے، اس لیے اسے بھی مکمل طور پر ختم کرنا اسلام کا مقصد نہیں ہو سکتا۔ قرآن حکیم نے گزری ہوئی قوموں کا ذکر کیا تو خاص طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں اس بات کا واضح بیان موجود ہے کہ انسان اگر دیانت داری سے سمجھتا ہے کہ اس میں فلاں صلاحیت موجود ہے، تو وہ اس کے اظہار کے لیے خدمت کے جذبے سے منصب کی طلب کر سکتا ہے۔ اس جذبے کا اظہار اس کے لیے معیوب بات نہیں ہونی چاہیے۔[2]

یہ بات بہ جائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ انسانی فطرت کا یہ تقاضا پورا کرنے کے لیے انسان کو میدان درکار ہوتا ہے، اور اس کے لیے میدان تلاش کرنا کوئی غیر مناسب عمل نہیں ہوگا۔

۱۔ شعب الایمان: ج ۱۱، ص ۱۷۵، رقم ۸۳۶۷

۲۔ یوسف: ۵۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ دونوں باتیں اگر ہمارے پیش نظر ہوں تو پھر سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اسلام کامیابی کا کون سا نیا زاویہ پیش کرتا ہے۔

بنیادی طور پر اسلام نے کسی فطری تقاضے کو مٹانے کی بات نہیں کی، اس کی تہذیب کی بات کی ہے، تہذیب کہتے ہیں کسی درخت یا پودے کو ایسی صورت دینا جو لوگوں کے لیے بھلی اور خوش نما معلوم ہو۔ تہذیب کا یہ عمل فطری تقاضوں کو دبا کر یا مٹا کر پورا نہیں ہو سکتا، ان تقاضوں کو کاٹ چھانٹ کر، انہیں خود انسان اور پھر معاشرے کے لیے مفید بنا کر ہی پورا ہو سکتا ہے۔ پودا اگر خودرو جھاڑ کی صورت میں مسلسل بڑھتا جا رہا ہے، اور یہ پودا آپ کے آنگن کا حصہ ہے، تو سب سے پہلے اس کی بے ترتیب بڑھتی ہوئی شاخوں سے آپ کا اپنا دامن ہی الجھے گا، پھر وہاں سے گزرنے والے اور آپ کے ہاں آنے والے مہمان، مرد و عورت اور بچے اس سے متاثر ہوں گے۔ مگر اپنی جگہ پر یہ خود سے بڑھتا ہوا پودا بھی قیمتی ہے، کم از کم زندگی اور ہریالی کی علامت تو ہے، لیکن اگر اسے کسی ماہر مالی کا ماہرانہ ہاتھ لگ جائے، اور اس کی شکل نکل آئے، اس کی اضافی شاخوں اور پتوں کو تراش دیا جائے تو یہ پودا ایک نئی صورت اختیار کر لے گا، اور پھر یہ پودا مزید خوش نما معلوم ہوگا۔ انسانی مزاج اور فطرت میں موجود تقاضے اگر اس تہذیب اسلامی کے عمل سے گزر جائیں اور اس کے تراش خراش کے بعد ایک نئی شکل صورت پالیں تو وہ خود فرد اور معاشرے کے لیے مفید تر ہو جاتے ہیں۔

اس کے برعکس اگر ان تقاضوں کی تہذیب نہ کی جائے، انہیں ترتیب نہ دیا جائے، ان کی اضافی شاخوں اور پتوں یا نقصان دینے والے، الجھنے اور الجھانے والے اجزا کو تراشا نہ جائے، ان کے لیے قاعدے اور ضابطے مرتب نہ کیے جائیں، تو پھر اس کے نقصانات بھی جھیلنا پڑتے ہیں، کبھی فرد کو، کبھی پورے معاشرے کو، کبھی معاشرے کے ایک حصے کو۔ ان تقاضوں میں تمام مادی، جسمانی اور وجودی تقاضے شامل ہیں۔

مثال کے طور پر انسان کمانا چاہتا ہے، یہ اس کی ذمے داری بھی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر بیان ہونے والے فرمان کے مطابق یہ فرائض کے درجے کی چیز ہے، لیکن اگر کمانا ہوس کی شکل اختیار کر لے، ضرورت سے بڑھ کر وہ لالچ بن جائے تو اس عادت سے سب سے پہلے تو انسان خود متاثر ہوگا کہ اس تگ و دو کے نتیجے میں اس کی زندگی کے دوسرے تقاضے، اور اس سے جڑے ہوئے دوسرے فرائض متاثر ہو جائیں گے، وہ اپنے روحانی اور جسمانی تقاضے میں پشت ڈال دے گا، اور پھر بڑھتے بڑھتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ پورے معاشرے کے لیے خطرہ بن جائے گا کہ جب کمانا ہی مقصود ٹھہرے تو جو کمائے، جیسے کمائے، پھر کمانے کی ضابطہ بندی تو اس کے لیے کوئی معنیٰ نہیں رکھتی۔ اب وہ دھوکہ بھی دے سکتا ہے، چھین بھی سکتا ہے، لوٹ بھی سکتا ہے، یہ سب باتیں معاشرے کو متاثر کریں گی۔ کم از کم وہ لوگ جو اس کے اطراف میں موجود ہیں، گھر میں محلے میں، خاندان میں، دفتر اور مارکیٹ میں۔ اس خطرے کو دور کرنے اور فطری تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کچھ ضابطے بنا دیے گئے، ان ضابطوں کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ زندگی خوب صورت بھی ہو سکتی ہے اور محفوظ بھی۔ اور یہی خوب صورتی انسان کی کام یابی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام یابی کے لیے سیرت طیبہ میں بہت سے راستے متعین کیے ہیں، بہت سی گُر کی باتیں ہمیں بتائی ہیں، بہت سے کام کر کے دکھائے ہیں، بہت سی رکاوٹیں اپنی حکمتِ عملی اور منصوبہ بندی سے دور کی ہیں، لڑنے والوں کو ہم خیال بنایا ہے، دشمنوں میں دوستیاں کرائی ہیں، مانگنے والے دینے والے بن گئے اور لینے والے دوسروں کے گھر چلانے لگے۔ ہم اس سلسلے میں آئندہ صفحات میں اسوۂ حسنہ کے ان جواہرات میں سے چند جواہر اور چند موتی پیش کرنے کی سعادت حاصل کریں گے۔ ان شاء اللہ

امید

انسان جب سفر کا آغاز کرتا ہے تو در حقیقت اس کا محرک انسان کی امید ہوتی ہے۔ انسان جب اپنے تعلیمی سلسلے کو شروع کرتا ہے تو اس کا بھی محرک اول اس کی امیدیں ہوتی ہیں۔ انسان جب عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے، کہیں ملازمت کا سلسلہ شروع کرتا ہے تو اس کا بنیادی محرک بھی اور اس کو اس شعبے میں لانے والا جذبہ بھی امید ہی ہوتی ہے۔ انسان اپنا ایک چھوٹا سا کاروبار شروع کرتا ہے، تو وہ بھی امید کے سہارے کھڑا ہوتا ہے، امید کے بغیر ایک دن بھی وہ اپنے کاروبار کو، اپنے چھوٹے سے کھوکھے کو نہ کھول سکتا ہے، نہ اس میں کام شروع کر سکتا ہے۔ اگر یہ امید ختم ہو جائے تو پھر انسان کا سفر تھم جاتا ہے، تعلیمی سلسلہ رک جاتا ہے، ملازمت ایک جگہ آکر ٹھہر جاتی ہے اور کاروبار آگے بڑھنے کی بہ جائے مزید پیچھے کی جانب جانے لگتا ہے۔

یہ امید کیا ہے؟ یہ کیسے پروان چڑھتی ہے؟ کیسے آگے بڑھتی ہے اور کیسے یہ مایوسی میں بدل جاتی ہے؟ امید ایک جذبے کا نام ہے، ایسا جذبہ جو انسان کو آگے بڑھانے پر اکساتا ہے۔ یہ جذبہ انسان کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خمیر میں رکھا گیا ہے۔ انسان کی مٹی جب گوندھی جارہی تھی تو اس میں جہاں دوسرے اجزا شامل کیے گئے، وہاں ایک بڑا حصہ اللہ تعالیٰ نے امید کا بھی اس کے وجود میں رکھ دیا۔ انسان اس جذبے کے تحت دنیا میں اپنے آخری لمحے تک جدوجہد کرتا ہے۔ کتنی کہانیاں آپ نے پڑھی ہوں گی اور کتنے سچے حالات ہمارے سامنے گزرتے ہیں کہ انسان کو علم ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری اسٹیج پر پہنچ چکا ہے، اس کی بیماری اس کو ختم کرنے پر تلی ہوئی ہے اور یہ اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوگی، لیکن وہ لمحہ آخر تک جدوجہد کرتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹروں کی پیشین گوئیاں پیچھے رہ جاتی ہیں، رپورٹیں فیل ہوجاتی ہیں اور انسان سارے اندازوں اور تخمینوں سے آگے بڑھ کر نہ صرف یہ کہ زندگی گزارتا ہے بل کہ بھرپور زندگی گزارتا ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کو ملاحظہ کیجیے! سفر ہجرت کی کیا کیفیت ہے! پورا مکہ آپ کے پیچھے لگا ہوا ہے، کچھ اپنے انتقامی جذبے کے تحت تو کچھ انعام کے لالچ میں سرگرداں ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف دو تین ساتھیوں کے ہم راہ ویرانوں میں چھپتے چھپاتے اور اجنبی راستوں پر سفر کرتے ہوئے جارہے ہیں۔ اسی دوران سراقہ نامی ایک شخص آپ کا پیچھا کرتے ہوئے قریب پہنچ جاتا ہے۔ انسانی مزاج کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ان حالات میں یہ توقع کرنا تک بعید نظر آتا ہے کہ کیا یہ سفر بھی ختم ہو سکتا ہے؟ کیا یہ مشکلات بھی ختم ہو سکتی ہیں؟ کیا قبا یا مدینہ منورہ تک پہنچنا بھی ممکن ہوگا؟ ان کیفیتوں میں سراقہ آتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیچھا کرتے ہوئے قریب پہنچ جاتے ہیں، اچانک اللہ کی رحمت سے معجزاتی طور پر ان کی سواری دھنس جاتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ رحمت پڑتی ہے، وہ باہر آتے ہیں، سواری بھی باہر آتی ہے، آپ سے معافی کی طلب گار ہوتے ہیں اور خدمت کی پیش کش کرتے ہیں، لیکن اس کیفیت میں جب کہ دنیاوی اسباب میں سے آپ کے پاس کچھ موجود نہیں ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف یہ کہ ان کی پیش کش قبول نہیں کرتے، بل کہ الٹا سراقہ سے کہتے ہیں کہ وہ کیا موقع ہوگا جب کسریٰ کے کنگن تمھارے ہاتھوں میں پڑیں گے۔ اس سے بڑھ کر امید اور کیا ہوگی؟(۳)

۳۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: سیرت حلبی: ج۲، ص۲۲۱

21095

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اعتماد و اعتبار

اگر ہم اپنی اس عملی زندگی میں غور کریں، تو ہمیں درجنوں بار قسم اٹھانی پڑتی ہے، درجنوں بار ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ میں سچ کہہ رہا ہوں، درجنوں بار ہماری زبان پر یہ جملہ آتا ہے کہ بھائی! میری بات مان لو، میرا اعتبار کرلو، میں آپ سے غلط بیانی نہیں کر سکتا، وغیرہ۔ اگر معاملہ اس سے بڑھ کر ہو، کوئی ڈیلنگ ہو، فیصلہ ہو تو پھر فون کروائے جاتے ہیں، رابطے کیے جاتے ہیں، سفارشات ڈھونڈی جاتی ہیں، تعلق استعمال کیے جاتے ہیں اور تعلق تلاش کیے جاتے ہیں کہ دوسرے فریق کو کیسے یہ اعتماد دلایا جائے کہ ہمارا یہ معاملہ صاف ہوگا۔ اور ایسے ہی معاملہ کرنا والا شخص خود بھی دوسرے فریق کے بارے میں کوئی ایسا شخص تلاش کرتا ہے، جو ان سے پہلے ڈیل کر چکا ہو، تاکہ معلوم کیا جا سکے کہ کیا یہ پارٹی قابل بھروسہ ہے؟ کوئی شخص کاروبار کے لیے مارکیٹ میں نکلتا ہے تو پہلا نقطہ اس کا یہی باور کرایا جاتا ہے کہ ہر دکان دار سے آپ ڈیل نہیں کریں گے، چند دکان دار ہیں، چند انتہائی مضبوط پارٹیاں ہیں، ان کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ ان سے کیا جانے والا معاملہ صاف رہے گا، پیسہ نہیں ڈوبے گا، بدمعاملگی سامنے نہیں آئے گی، رقم کی ادائیگی میں، قیمت کے تعین میں، مارکیٹ ویلیو میں کوئی ہیر پھیر نہیں ہوگی۔

یہ ایک انسانی زندگی ہے، زندگی کی ایک حقیقت ہے، ڈیلنگ کا ایک طے شدہ اسلوب ہے۔ یہ ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا کا کوئی کام اعتماد اور اعتبار کے بغیر کام یاب نہیں ہو سکتا، پروان نہیں چڑھ سکتا۔ مارکیٹ میں اگر ایسا شخص ایک بار اپنا اعتماد کھودے تو وہ دوبارہ پہنچنے کی پوزیشن میں نہیں آسکتا، آئے گا تو اس کو ایک طویل سفر درکار ہوگا، ایک مسلسل محنت اور جدوجہد درکار ہوگی، اپنے چہرے پر ایک بار لگے داغ کو مٹانے کے لیے طویل محنت سے گزرنا ہوگا، اور صبر آزما مشقت جھیلنا ہوگی۔

لیکن اسلام کا پیغام اس سے بالکل الگ ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے کوئی اور شکل پیش کرتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے جو نکتہ ہمیں معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اعتماد اور اعتبار انسان کی شخصیت کا کبھی جدا نہ ہونے والا حصہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں ہیں، آپ دیکھتے ہیں کہ شہر سے باہر کوئی قافلہ ٹھہرا ہوا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے جاتے ہیں، بات چیت ہوتی ہے، حال احوال پوچھتے ہیں اور معلوم کرتے ہیں کہ وہ لوگ کہاں سے آئے ہیں؟ کیوں آئے ہیں؟ وہ ایک تجارتی قافلہ تھا، جس میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے اور جانور بھی تھے۔ دوران گفت گو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک جانور نظر آیا تو آپ ان سے پوچھتے ہیں کہ یہ بہ رائے فروخت ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ جی، اور اس کی یہ قیمت ہے، اگر آپ لینا چاہیں تو لے سکتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رقم کا تعین کر کے اس کی ڈوری تھامتے ہیں اور جانور کو لے کر چلے آتے ہیں کہ میں رقم بھجواتا ہوں۔ یہ معاملہ ایسے ہی اچانک ہو جاتا ہے کہ قافلے والوں کو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رخصت ہو جاتے ہیں تو آپس میں چہ میگوئیاں شروع ہو جاتی ہیں کہ ایک اجنبی شخص کو ہم نے بغیر کچھ کہے سنے، بغیر تعارف کے جانور دے دیا۔ اجنبی جگہ ہے، اس کا اتا پتا معلوم نہیں، اگر یہ شخص لوٹ کر نہ آیا تو ہماری رقم کا کیا ہوگا؟ لیکن اسی قافلے کی ایک خاتون عجیب جملہ کہتی ہیں کہ فکر نہ کرو، تمھاری رقم تمھارے پاس آجائے گی، تمھارا کوئی نقصان نہیں ہوگا، کیوں کہ ایسا روشن چہرہ میں نے کبھی نہیں دیکھا اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ کبھی دھوکا نہیں دے سکتا۔ کچھ وقت گزرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی نمائندہ آتا ہے، ان کی ضیافت کے لیے کچھ کھانے کا سامان لاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے لیے بھیجا ہے اور یہ جانور کی قیمت ہے۔ مہمان کی حیثیت سے مہمان نوازی الگ کی جاتی ہے اور جو سودا طے ہوا ہے، اس کی رقم الگ سے ان کو عطا کر دی جاتی ہے۔[۴]

دراصل یہ مسلمان کا کردار ہے اور یہی کردار بہ طور مسلمان اس کی کام یابی کی ضمانت ہے کہ اس کو زبان سے اپنا اعتماد دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی باڈی لینگویج، اس کا لہجہ، اس کا اسلوب اور سب سے بڑھ کر اس کا روشن چہرہ لوگوں کے لیے خود ایک دلیل، گواہ، ثبوت اور اعتماد ہونا چاہیے، جس کی بنیاد پر وہ بڑے سے بڑا فیصلہ کر سکے۔

آغاز کی مشکل

کچھ کام آسان ہوتے ہیں، کچھ مشکل۔ لیکن اکثر کام ایسے ہوتے ہیں، جن کا آغاز ہی مشکل ہوتا ہے، آغاز ہو جائے تو کام رفتہ رفتہ آسان ہوتا چلا جاتا ہے، مگر چوں کہ انسان پہلا قدم ہی اٹھاتے ہوئے ڈرتا ہے، اس لیے دوسرے قدم کی نوبت ہی نہیں آپاتی۔ یہ ایک نفسیاتی گرہ ہے، جسے ہم جس قدر جلد کھول لیں، اسی قدر جلد کام یاب ہو سکتے ہیں۔

۴۔ الدار قطنی: ج ۳، ص ۴۶، رقم ۱۸۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب سوال یہ ہے کہ آغاز مشکل کیوں ہے؟ انسانی مزاج میں مانوس چیزیں نامانوس چیزوں سے الگ اور مختلف ہوتی ہیں، بچہ جن شکلوں سے مانوس ہوتا ہے، ان سے خوب کھیلتا ہے، جن کو اجنبی سمجھتا ہے، ان سے سلام بھی مشکل سے کرتا ہے۔ انسان اپنی ملازمت سے رفتہ رفتہ مانوس ہو جاتا ہے، پھر اس کے لیے کوئی اجنبیت نہیں رہتی۔ مگر جب کسی سبب سے اسے اپنی ملازمت تبدل کرنی پڑے تو اسے نئے ماحول میں نئے سرے سے محنت درکار ہوتی ہے، تاکہ وہ اپنے آپ کو وہاں کے ماحول میں جذب کر سکے۔ یہ انسانی مزاج کی مشکل ہے۔ اور یہ کسی بھی کام کے آغاز کی ایک مشکل ہے، ایسی بہت سی مشکلات ہیں، جن سے ہمارا واسطہ پیش آتا ہے۔ ان میں سے ایک ردعمل ہے، نئے کام کے آغاز میں دسیوں طرح کا ردِ عمل سامنے آسکتا ہے۔ دیکھا جائے تو اس کا سبب بھی نامانوس ہونا ہی ہے۔ نئی بات، نئی صورت، نئی جگہ، نیا لہجہ سب مانوس ہونے میں وقت لیتے ہیں، اور جب تک ایک انسان مانوس نہ ہو اس وقت تک مخالفت اور ردعمل ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔

ان حالات میں ہماری اصل آزمائش یہ ہے کہ ہم نئے حالات سے کس قدر جلد مانوس ہوتے ہیں، نئے حالات میں اپنے امکانات کیسے دیکھتے ہیں، اور آغاز کی مشکلات سے اپنی راہیں کیسے نکالتے ہیں۔

سیرتِ طیبہ کا مطالعہ اس حوالے سے بھی ہمیں نئی معلومات فراہم کرتا ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے آغاز کے مراحل دیکھیے، کس قدر مشکلات ہیں، اور ہر مشکل نئی نوعیت کی ہے، پھر ان سب کا مقابلہ کیا گیا، نئے حالات میں نئے راستے سوچے گئے، نئی راہیں نکالی گئیں اور مسلسل جدوجہد کے ذریعے بالآخر آپ ﷺ اپنے مقصد میں مکمل طور پر کامیاب ہو گئے۔

ہجرت حبشہ ہو یا سفر طائف، ہجرت مدینہ ہو، یا مختلف مخالفین کی جانب سے مسلط شدہ محاذ جنگ، ان لڑائیوں میں مقابلے کے لیے نئے راستے اور نئے امکانات مشوروں کی صورت میں سامنے آئے، اور نئی نئی تدابیر سوچی گئیں، اور ان سب ہی مواقع پر رسول اللہ ﷺ نے ان مشکلات کو جھیلا اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے نئے نئے راستے سوچے اور ان پر چل کر دکھایا۔

درحقیقت یہ حوصلوں کی جنگ ہوتی ہے، یہ اعتماد کا امتحان ہوتا ہے، یہ قوت فیصلہ کی مشق ہوتی ہے، اور ان میں کامیاب وہی ٹھہرتا ہے، جو کامیاب ہونے کا حوصلہ، جذبہ اور خواہش رکھتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میانہ روی میں ہی بھلائی ہے

انسان جذبات ایک سطح پر کبھی نہیں رہتے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو متوازن زندگی کا عادی بنانے میں کام یاب ہوجائے۔ غیر متوازن زندگی کا نقصان یہ ہے کہ انسان ایک جانب جھکنے کی وجہ سے دوسری جانب کا حق ادا نہیں کرپاتا، حال آں کہ دونوں جانب انسان ضرورتیں ہی ہوتی ہیں، جب کسی ایک جانب کی ضرورتیں انسان نظر انداز کرتا ہے، تو یہ اس کا اپنا نقصان ہوتا ہے، اور اس نقصان کے نتیجے میں اس کی اپنی زندگی میں کسی نہ کسی حوالے سے کوئی کمی رہ جاتی ہے، ایسی کمی، جس کے ساتھ انسان کام یاب زندگی نہیں گزار سکتا۔

ایک دفعہ تین صحابہ کرامؓ کاشانہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضر ہوئے اور آپ کی عبادت کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہیں، پھر ان میں سے ایک نے کہا کہ میں پوری رات شب بیداری میں گزارا کروں گا، دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزے سے رہوں گا، تیسرے نے کہا میں کبھی عورت کے پاس نہیں جاؤں گا، اس گفت گو کی اطلاع جب آں حضرت ﷺ کو ہوئی تو آپ نے ان سے فرمایا کہ تم لوگوں نے یہ کیا بات طے کی ہے:

> اما واللّٰہ انی لاخشاکم للہ واتقاکم لہ، لکنی اصوم وافطر واصلی وارقدواتزوج النساء، فمن رغب عن سنتی فلیس منی (۵)
>
> خدا کی قسم میں تم لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا خوف رکھتا ہوں، اور اس کا اطاعت گزار بھی ہوں، لیکن کیا تم نہیں جانتے کہ میں روزے بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور رات میں سوتا بھی ہوں، نکاح بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے تعلق بھی رکھتا ہوں، لہٰذا سن لو کہ نکاح میری سنت ہے، اور جو شخص میرے اس طریقے سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے نہیں ہے۔

نبی رحمت علیہ الصلاۃ والسلام نے انسانی زندگی کے ہر شعبے میں اعتدال کی تلقین کی ہے اور افراط و تفریط سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے، اسلام کا مطلوب ایسا شخص ہے جو ہر معاملے میں میانہ روی کو پیش نظر

۵۔ بخاری: ج ۳، ص ۲۶۲، رقم ۵۰۶۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رکھے اور اس کا طرز عمل افراط و تفریط دونوں سے یک سر پاک ہو، در حقیقت تعلیمات اسلام اعتدال کا دوسرا نام ہے۔

کسی ایک جانب جھک جانا، اور کسی ایک یا کئی ایک ضرورتوں کو نظر انداز کر دینا انسان کو ادھورا بنا دیتا ہے، اور ادھورا آدمی کبھی کام یابی نہیں حاصل کر سکتا۔ انسان کی کم زوری یہ ہے کہ جب وہ ایک طرف جھکتا ہے تو جھکتا ہی چلا جاتا ہے، پھر توازن پیدا کرنا اس کے لیے مشکل تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

زبان کی سچائی

انسان صبح اٹھنے کے بعد دوبارہ بستر پر لوٹنے تک جو چیز سب سے زیادہ استعمال کرتا ہے اور اس کا استعمال لوگوں کے سامنے آتا ہے وہ شاید زبان ہے۔ انسان مسلسل بولتا ہے، ضرورتاً بھی، بلا ضرورت بھی، اپنے کام کے لیے بھی، دوسروں کے کام کے لیے بھی، محض اپنے اندر کی کیفیتوں کو باہر بیان کرنے کے لیے بھی اور دوسروں کو مطمئن اور خوش کرنے کے لیے بھی، لیکن یہ زبان اپنا ایک مقام بھی رکھتی ہے اور اپنا ایک وزن بھی۔ اگر یہ وزن اس کو مل جائے تو یہ زبان اپنی زبان والے کو وزن دار شخصیت بنا دیتی ہے، اور اگر اس زبان کا اپنا وزن ختم ہو جائے یا یہ اپنا وزن کھو دے تو وہ شخصیت بھی اپنا احترام کھو دیتی ہے۔ در حقیقت زبان کا احترام ختم نہیں ہوتا، زبان والی شخصیت کا احترام ختم ہو جاتا ہے۔ ہماری اس زندگی میں سب سے زیادہ غیر محتاط استعمال زبان کا ہے، لیکن وہ اس کے اخلاقی اور مذہبی تصورات ہیں، ہم نے صرف زندگی کی کام یابی کی حوالے سے گفت گو کرنی ہے۔

اگر ہم عملی زندگی میں ایک چھوٹی سی کاروباری شخصیت کو دیکھیں تو اس کا چھوٹا سا کھوکھا بھی زبان کے اعتبار کے بغیر کام یاب نہیں ہو سکتا۔ ہمارے بہت سے کاروبار ایسے ہیں جو سو فیصد زبانی ہیں، اور زبانی بھی ایسے کہ معاملہ کرنے والی دونوں شخصیات بعض اوقات ایک دوسرے سے چہرہ شناس بھی نہیں ہوتیں، فون پر ہی تمام معاملات طے ہو جاتے ہیں۔ اور اب تو زمانہ نئی کروٹ لے چکا ہے، ایس ایم ایس پر، واٹس ایپ پر، میسنجر پر، ای میل پر اور خدا جانے کمیونیکیشن کی کیا کیا ٹولز موجود ہیں، ان کے ذریعے انسان بات کر رہا ہے، اپنی بات سمجھا رہا ہے اور دوسروں کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ تمام چیزیں اگر انسان کو کام یاب بناتی ہیں یا انسان کو اس کے شعبے میں اعتبار دیتی ہیں اور شخصیت کا بھرم قائم رکھتی ہیں تو صرف زبان کی سچائی اور اس پر اعتماد کی وجہ سے ہی ایسا ممکن ہوتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہماری بات کی صداقت بہت بڑی حقیقت ہے۔ قرآن کریم، احادیث نبویہ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ پوری تفصیل سے اس کے مختلف پہلوؤں اور جہتوں کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے، لیکن جو سب سے بڑی حقیقت ہے وہ یہ کہ زبان کی سچائی زبان کو اعتبار دیتی ہے اور زبان کا اعتبار ہی واحد دولت ہے، جو انسان کو اس دنیا میں ایک مقام کا حامل بناتی ہے۔ انسان بہت کچھ کہتا ہے، مگر وہ سب کچھ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے جب وہ اپنی زبان سے پھر جاتا ہے۔ یہ زبان کا بھرم، اعتماد اور اعتبار انسان کو اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا، جب تک وہ اپنی زندگی میں موجود دورنگی کو ختم نہیں کرتا۔ انسان گھر میں کچھ ہوتا ہے، باہر کچھ ہوتا ہے۔ یہ دوئی جب اس کی زندگی کا حصہ بن جاتی ہے تو پھر وہ باوجود کوشش کے سچائی کے اس مقام پر نہیں آسکتا۔ اس کا ایک ہی حل ہے کہ انسان اس دوئی کو ختم کرے، انسان پوری زندگی میں ایک رنگ، ایک رخ اور ایک انداز اختیار کرے، اور وہ ہے ہر وقت سچ بولنا!

جناب رسول اللہ ﷺ کی سچائی ایسی جانی پہچانی حقیقت تھی کہ آپ کا انتہائی مخالف ترین شخص ابوجہل بھی یہ کہتا ہے کہ اے محمد! میں تمہیں جھوٹا نہیں کہتا، لیکن میں تمھارے پیغام کو تسلیم نہیں کرتا۔ اندازہ کیجیے کہ ایک ایسا شخص جو آپ کی زندگی کا بھی گاہک بن چکا ہے، اس کے سامنے موت اور زندگی کی کوئی حقیقت ایسی نہیں ہے جس کا سامنا کرنے سے وہ کترائے۔ وہ ہر مرحلے سے گزرنا پسند کرتا ہے، لیکن یہ کہنے کی ہمت نہیں پاتا کہ رسول اللہ ﷺ بھی کوئی غلط بات کہہ سکتے ہیں، آپ کی زندگی میں جھوٹ کا کوئی شائبہ بھی پایا جاسکتا ہے۔ ہمیں اس دنیا میں کوئی کام کرنا ہے، اور اپنے آپ کو کامیاب شخصیات میں شمار کرانا ہے تو سچائی کی اسی بلندی کو حاصل کرنا ہوگا۔

زبان کو باوزن بنائیے، وہ آپ کی شخصیت میں وزن پیدا کردے گی، اور زبان کا وزن اس کی سچائی میں پوشیدہ ہے۔

وعدے قیمتی بنائیے

زبان پر بات ہو چکی، انسان ایک قیمتی وجود ہے، اس کی ہر بات کا ایک وزن ہے، اس کا وجود قیمتی ہے، اس قدر کہ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ کسی ایک انسان کو زندگی بخشنے کا مطلب پوری انسانیت کو زندہ کردینا ہے۔ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا[6] اس انسان کی یہ قیمت صرف اس کے وجود

۶۔ المائدہ: ۳۲۔ اور جس نے کسی کو زندہ رکھا تو گویا اس نے سب کو زندہ کردیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے اعتبار سے نہیں، اس کا سب کچھ قیمتی ہے۔ انسانی وجود میں اس کی زبان انتہائی اہم مقام رکھتی ہے۔ یہ صرف چکھنے اور ذائقوں کو پہچاننے کے کام نہیں آتی، یہ بول چال، تلفظ، ادائیگی ہر معاملے میں اپنا وجود اور اپنا وزن رکھتی ہے۔ اس زبان کی اہمیت دوہری ہے، یہ انسان کے لیے تو قیمتی ہے ہی، اس سے انسان اپنی شخصیت کو بھی وزن دے سکتا ہے۔ اس کا ایک پہلو وعدے کی تکمیل ہے۔ انسان زبان سے اگر کہتا ہے کہ میں فلاں کام فلاں وقت پر انجام دوں گا، تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کو یہ کام اب کرنا ہوگا، اب یہ صورت کسی بھی ذہن میں نہیں آسکتی کہ اس کے برعکس بھی کچھ ہو سکتا ہے؟ اس لیے کہ یہ بات کائنات کے انتہائی قیمتی وجود انسان کے قیمتی ترین حصے زبان سے ادا ہوئی ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے، جس سے شخصیت بنتی ہے، جس سے انسان کا وجود وزنی محسوس ہوتا ہے، جسے ہر کسی کے لیے اپنے مقام سے ہٹانا ممکن ہوتا ہے، یہی آدمی اپنی عملی زندگی میں کامیاب ٹھہرتا ہے، جسے کوئی طاقت ناکام نہیں کر سکتی کہ سب سے بڑی ذات اللہ تعالیٰ کی قوت اس کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے۔

سب لوگ جانتے ہیں کہ جنگ بدر کے موقع پر مسلمانوں کی افرادی قوت بہت کم تھی اور مسلمانوں کو کمک کی بہت ضرورت تھی مگر میدان جہاد میں بھی دشمن کے مقابلے میں، اور دشمن بھی وہ جو آپ کو نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بلند ترین اخلاقی معیار کو پورے اعزاز کے ساتھ برقرار رکھا، اس موقع پر دو اصحاب رسول حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو حسیل رضی اللہ عنہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)، ہم مکے سے آرہے ہیں، راستے میں مشرکین نے ہمیں گرفتار کر لیا تھا، اور اس شرط پر رہا کیا ہے کہ ہم لڑائی میں آپ کا ساتھ نہیں دیں گے، مگر یہ مجبوری کا عہد تھا، ہم کافروں کے خلاف ضرور لڑیں گے، مگر نبی رحمت ہادی اعظم ﷺ نے فرمایا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انصرفا، نفي لهم بعهدهم، ونستعين الله عليهم (۷)

تم میدان جنگ سے واپس چلے جاؤ، ہم ہر حال میں ان سے اپنا وعدہ ضرور پورا کریں گے،

ہمیں صرف خدا کی حمایت ومدد درکار ہے۔

عین میدان جنگ میں رسول خدا کی ہم رکابی اور دشمنان دین سے لڑنے کی خواہش رکھنے والے فرزندان توحید کو اپنے دشمن سے بہ امر مجبوری کیے گئے وعدے کی پاس داری کی تلقین، جب کہ عددی طور پر دشمن کے مقابلے میں بہت کم ہونے کے سبب اس وقت ایک ایک فرد کی اہمیت تھی، یہ سب رسولِ اکرم ہادی اعظم ﷺ کے نبی اخلاق ہونے کی واضح مثال نہیں تو اور کیا ہے؟

مگر ہم نے ان اخلاق سے کیا سیکھا ہے؟ اب تک کے تجربے سے لگتا تو یہی ہے کہ وعدہ پورا کرنا، زبان کا خیال، کسی کو دیے گئے وقت کی اہمیت، ہماری زندگی میں کچھ ہے ہی نہیں، سو پھر ہم کامیابی کیوں کر پا سکتے ہیں؟ اور اچھی، متوازن، نمایاں اور لوگوں کی نظر میں قابل اعتبار شخصیت کیسے بنا سکتے ہیں؟

بار بار کوشش

انسانی مزاج یہ ہے کہ وہ عجلت پسند ہے، فوری نتائج حاصل کرنا چاہتا ہے۔ انسان جب کوشش کرتا ہے تو عام طور پر نتائج اس کے سامنے نہیں ہوتے۔ نتائج کے لیے صرف وہ اندازے لگا سکتا ہے، اندازے کا مفہوم ہی یہی ہے کہ وہ حقیقت کے مطابق نہیں ہے، ممکن ہے، وہ درست ہو، ممکن ہے وہ درست نہ ہو، ممکن ہے آپ کا اٹھایا ہوا قدم وہی نتائج دے جو آپ کو مطلوب ہیں، ممکن ہے کہ وہ نتائج نا نکلیں۔ اس لیے انسان کو اپنی صلاحیتیں استعمال کرتے ہوئے دو چیزیں پیش نظر رکھنی چاہییں۔

۱۔ سب سے پہلے ہدف متعین کرنے کے بعد بار بار کوشش کرنا۔

۲۔ اور دوسرا ناامیدی اور مایوسی کو قریب سے پھٹکنے نا دینا۔

ایک مسلمان کا معاملہ تو بالکل مختلف ہے، اس لیے کہ اس کی زندگی میں مایوسی اور ناامیدی کا تصور صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس کا اپنے رب پہ ایمان کم زور ہو، اگر وہ اپنے رب پر ایمان رکھتا ہے تو اس کے لیے یہ تصور کرنا کہ وہ مایوس ہو جائے کسی لمحے بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ ایمان کے ساتھ مایوسی جمع ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لیے کہ مایوسی کا مفہوم یہ ہے کہ اس کا اپنے رب رحمت پر ایمان کم

۷۔ مسلم: ج۳، ص۱۵۹، رقم ۱۷۸۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زور پڑ گیا۔ یعنی اب وہ سمجھتا ہے کہ میں کام یاب نہیں ہو سکتا، کام یابی کون دیتا ہے اور ناکامی کہاں سے آتی ہے، ظاہر ہے کہ یہ سب من جانب اللہ ہے، تو جب اللہ تعالیٰ موجود ہے، اللہ کی رحمت یعنی رب ہونے کا یقین ہے تو پھر انسان کے ذہن میں یہ شیطان وسوسہ کسی صورت پیدا ہی نہیں ہو سکتا، یا کم از کم نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ناکام ہو سکتا ہے۔ اس کی حکمت عملی ناکام ہو سکتی ہے، حکمت عملی تبدیل کی جا سکتی ہے، اس کا منصوبہ ناکام ہو سکتا ہے اس منصوبے کی جگہ دوسرا منصوبہ لایا جا سکتا ہے، مگر وہ مایوس ہو کر جدوجہد چھوڑ دے، یہ مومن کا شیوہ نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے بھی دعوت کا جب آغاز کیا تو آپ کا سب سے پہلا ہدف اہل مکہ تھے، آپ ﷺ نے اہل مکہ کے لیے کوشش کی، اہل مکہ کو مختلف انداز میں دعوت پہچانے کے لیے آپ ﷺ نے محنت فرمائی جب آپ ﷺ نے دیکھا کہ حالات مسلمانوں کے لیے کٹھن ہو رہے ہیں، ان کے لیے مشکل ہو رہا ہے کہ وہ وہاں رہ سکیں اور کلمہ حق بلند کر سکیں، اللہ کے پیغام کو خود اپنی زندگی کا حصہ بھی بنا سکیں اور دوسرے انسانوں تک بھی پہنچا سکیں تو آپ ﷺ نے حکمت عملی تبدیل کی اور پہلے مرحلے میں حبشہ کے لیے آپ نے مسلمانوں کو روانہ فرمایا، خود نہیں گئے یہ بھی حکمت عملی کا حصہ ہے، ہجرت حبشہ کی بہت تفصیل ہے، ہمیں پڑھنا چاہیے اس میں ہمارے لیے بہت سے راز پوشیدہ ہیں، لیکن سر دست ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ہجرت حبشہ آپ ﷺ نے فرمائی ہجرت حبشہ کے بعد نتائج مکمل طور پر نہیں نکلے تو آپ طائف چلے گئے۔ طائف آپ ﷺ خود تشریف لے گئے، وہاں بھی فوری طور پر آپ کو نتائج نہیں ملے، آپ ﷺ وہاں سے پھر تشریف لاتے ہیں، پھر آپ قبائل عرب پر مزید محنت فرماتے ہیں، یوں اس بار آپ ﷺ ہجرت مدینہ منورہ کی منصوبہ بندی میں کام یاب ہو جاتے ہیں۔ یہ تیسرا بڑا مرحلہ ہے۔ جناب رسول اکرم ﷺ نے اس تیسرے منصوبے سے اپنے اہداف حاصل کیے، اور اس کے ذریعے ریاست بھی قائم ہوئی مسلمانوں کو سائبان بھی میسر آیا اور رسول اکرم ﷺ نے اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے وہ آخری محنت مکمل فرمائی، جس کے بعد آپ ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا:

اللّٰھم اشھد

اللہ گواہ رہنا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ناکامی

ناکامی انسان کے لیے ہمیشہ دنیا میں ناکامیوں کا پیغام نہیں لاتی، بل کہ بعض ایسے مرحلے بھی ہوتے ہیں، جب ناکامی اس کے لیے کام یابی کا عنوان بن جاتی ہے، بل کہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ناکامی، کام یابی کی بنیاد رکھنے کا سبب بنتی ہے اور اس کی اساس کا پتھر قرار پاتی ہے، یہ ایک عجیب سی بات ہے۔ بعض اوقات انسان اپنے انداز سے سوچتے ہوئے یہ محسوس کرتا ہے کہ فلاں شعبہ یا زندگی گزارنے کا فلاں ڈھب، کاروبار، تعلیم، رشتے داریاں اور تعلقات، غرض درجنوں انداز کی چیزیں ہیں، ان کے بارے میں جو میں سوچ رہا ہوں، وہ درست ہے اور مجھے یہیں کام یابی ملے گی، اور یہیں کام یابی ملنی چاہیے۔ وہ اس کے لیے کوشش بھی کرتا ہے، منصوبہ بندی بھی کرتا ہے، دعائیں بھی کرتا ہوگا، لیکن کام یابی نہیں ملتی، اسی دوران کوئی ایسا مرحلہ آتا ہے کہ کسی کے کہنے سے یا دل کے سمجھانے سے، یا غور و فکر کے بعد یا حادثاتی طور پر انسان کسی اور طرف چلا جاتا ہے۔ اب جوں ہی وہ مڑتا ہے اور ارادہ بدلتا ہے تو کام یابی کا سفر شروع ہوجاتا ہے۔ تب جا کر انسان کو اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں ناکامی بنیادی طور پر اس لیے تھی کہ وہاں اس کے لیے جو امکانات تھے، اللہ تعالیٰ اس سے کہیں آگے کے امکانات اس کے لیے طے کرچکا تھا۔ کتنی مثالیں ہمارے اردگرد بکھری ہوئی ہیں کہ ایک شخص کسی ایک شعبے میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے، مگر ناکام ہوجاتا ہے، پھر وہ شعبہ تبدیل کرلیتا ہے تو کام یابی ایسے اس کے قدموں کو چومتی ہے کہ پھر وہ پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھتا۔

عبدالستار ایدھی سماجی اعتبار سے ہمارے ہاں مشہور شخصیت تھی، بہت کم لوگوں کے علم میں ہوگا کہ وہ سیاست میں بھی رہے، الیکشن میں بھی کھڑے ہوئے، پھر وہی ہوا جو ایسے لوگوں کا مقدر ہوتا ہے، ہار گئے، حکیم سعید صاحب نے بھی الیکشن میں لڑنے کی کوشش کی، لیکن کام یابی نہ ملی، اس کے لیے انہوں نے سیاسی تعلقات بھی پالے، پارٹیاں بھی جوائن کیں، لیکن ان شخصیات کو آج جو عروج ملا، تصور کیجیے کہ اگر وہ الیکشن میں کام یاب ہوجاتے تو یہ عروج ملتا؟ اور یہ بلند قامت ادارے جو انہوں نے کھڑے کر دیے، کیا وہ سیاست میں رہتے ہوئے کھڑے کر سکتے تھے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ کے موقع پر مکہ مکرمہ تشریف لے جاتے ہیں، مقصد صرف عمرہ کرنا ہے، اب اگر دنیا کی نظر سے دیکھا جائے، یا یوں کہیے کہ ایک ناکام شخص کی ادھوری نظر سے دیکھا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ سفر کام یاب نہیں ہے، کیوں کہ آپ تو عمرے کے لیے گئے تھے اور عمرہ ادا نہ ہوسکا۔ پھر آپ ﷺ مذاکرات میں شریک ہوئے ہیں، لیکن مشرکین مکہ کی شرائط آپ کو ناپسند ہونے کے باوجود انہیں قبول کرنا پڑا۔ دنیا کے الفاظ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صلح دب کر کی ہوئی محسوس ہوتی ہے، لیکن جب نبوت اور بصیرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، تو وہاں کام یابی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کر لیتے تو نہ مذاکرات ہوتے، نہ سیاسی مفاہمت ہوتی، نہ دس سال کا معاہدہ ہوتا، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یکسوئی حاصل ہوتی کہ آپ واپس تشریف لا کر فوراً خیبر کی طرف روانہ ہو پاتے۔ عمرے کے مسئلے پر اختلاف ہوا، مذاکرات ہوئے، معاہدہ ہوا، اور مسلمان خیبر روانہ ہوئے، پھر آپ نے غزوۂ خیبر میں کام یابی حاصل کر کے مسلمانوں کو ایک بہت بڑی آزمائش سے نجات دلادی۔ یہ سب کچھ بہ ظاہر اس ناکامی کا تحفہ ہے، جو عمرہ ادا نہ کرنے کی صورت میں پیش آئی تھی۔

کام یابی کو کبھی حتمی نہیں سمجھنا چاہیے اور ناکامی کو کبھی ناکامیوں کی بنیاد تصور نہیں کرنا چاہیے۔ انسان کی حوصلہ مندی اور کام یابی یہ ہے کہ وہ ناکامیوں سے اپنے لیے راستہ چنتا ہے اور اپنی شکستوں سے کام یابی اور فتوحات کے نئے نئے زاویے اور نئے نئے راستے کشید کرتا ہے۔

ہم ناکام نہیں

زندگی میں کوئی بھی کام کرتے ہوئے، ایک بہت بڑا خطرہ جو ہمارے ذہنوں پر ہمیشہ مسلط رہتا ہے، اور بعض اوقات ہمیں آگے بڑھنے سے روکنے کا سبب بھی بن جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم ناکام ہو جائیں گے یا ناکام ہوگئے ہیں۔ اسی طرح ماضی کے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے بھی جب ہم ان کے حالات و واقعات کو اور ان کی خدمات کو بیان کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں ایک بات ہوتی ہے کہ شاید وہ اپنے منصوبوں میں کام یاب نہیں ہو سکے اور اپنی خدمات پوری طرح انجام نہیں دے سکے، لیکن اللہ تعالیٰ کے اس کائنات کو تشکیل دینے کے پس منظر میں موجود بنیادی مقصد یا اس کائنات کی تعمیر میں اس کی جو حکمت ہمارے سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی شخص کبھی بھی اپنے گمان کے مطابق سو فیصد کسی منصوبے کی تکمیل نہیں کر سکتا۔ اسی لیے دیکھیے! سوچنے والے ذہن میں ایک منصوبے کی تکمیل کے بعد دوسرا منصوبہ، دوسرے کے بعد تیسرا منصوبہ آتا رہتا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟ اگر کوئی شخص مکمل طور پر کام یاب ہو کر دنیا سے رخصت ہو، اس معنی میں کہ وہ ہر طے شدہ منصوبہ مکمل کر لے اور کوئی کام اس کے پیچھے ادھورا نہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو تو اس کا واضح طور پر مفہوم ہوگا کہ اس کے مرنے کے بعد کسی تبدیلی کی یا اس کی جانشینوں کو اس کے کام کو آگے بڑھانے کی ضرورت نہیں رہی۔ دوسری جانب حقیقت یہ ہے کہ یہ کائنات قیامِ قیامت تک آنے والی آخری صبح تک اپنا سفر آگے، جاری رکھے گی، جب کائنات کا سفر جاری رہے گا تو کائنات کے نظام کے اندر ہمیشہ جاری رہنے والے منصوبے کیسے قیام قیامت سے پہلے مکمل ہو سکتے ہیں؟ ہاں ان کا ایک حصہ جزوی طور پر مکمل ہو سکتا ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو نبوت عطا کی گئی، اس کو ختم نبوت کے عنوان سے سرفراز بھی کیا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کردہ دین کی حقیقت کو سمجھے بغیر اس کو سمجھنا مشکل ہے۔ بنیادی طور پر انسان کے مزاج میں جب پختہ پن آگیا تو ختم نبوت کا اعلان ہو گیا، اب اصولوں اور بنیادی ضابطوں میں تبدیلی کی گنجائش نہیں تھی، اس لیے اس سلسلے کی تکمیل فرما دی گئی، لیکن اس کے بعد جو چیزیں انسان کے مزاج میں جزئیات کے درجے میں تبدیلی پسند تھیں، یا جن میں تبدیلی ممکن تھی، ان کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو یہ ذمے داری تفویض کی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نظام کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت اور رسالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس تسلسل کو آگے بڑھائیں۔

اسی لیے احکامات کو واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا:

۱۔ ایک وہ جو منصوص علیہ احکام ہیں، نص کی صورت میں واضح طور پر ہمارے سامنے موجود ہیں، جن میں کسی بھی شخص کے لیے کمی بیشی تو کیا ہلکی سی تبدیلی کرنے کی گنجائش بھی موجود نہیں ہے۔

۲۔ دوسرے وہ احکامات ہیں جن کو فروعی احکامات بھی کہا جا سکتا ہے، ان میں ایک بڑی تعداد ایسی احکامات پر مشتمل ہے جو اصل ماخذ سے بہ راہ راست استفادہ کر کے تو حاصل کیے گئے ہیں، لیکن وہ قرآن و سنت میں ان ہی الفاظ اور اسی تفصیل کے ساتھ موجود نہیں ہیں۔ ان کو استنباط کے بعد حاصل کیے ہوئے مسائل کہا جاتا ہے۔ یہی سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا اور امت کا یہی بنیادی فریضہ ہے۔ یہ فریضہ ادا کرنے والے ہر دور میں آتے رہیں گے اور ماضی سے حاصل شدہ سبق اور پچھلوں سے ملنے والی میراث کو مستقبل کی نسل تک پہنچانے کا فریضہ سرانجام دے کر دنیا سے رخصت ہوتے چلے جائیں گے۔ کسی کا کام بہ ظاہر تھوڑا ہوگا، لیکن وہ کیفیت میں زیادہ ہوگا۔ کسی کا کام کمیت میں زیادہ ہوگا لیکن ادھورا ہوگا۔ کسی کا کام بہ ظاہر ایسا محسوس ہوگا کہ مکمل ہے لیکن آئندہ آنے والا اس مکمل کام میں بھی اتنے نئے پہلو تلاش کر لے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گا کہ انسان کو حیرت میں مبتلا کر دے گا، لیکن یہ سفر جاری رہنے کے لیے ہے، اور یہ سفر جاری رہے گا۔ ہر شخص اپنے حصے کے چراغ جلانے پر مامور ہے، سو یہ چراغ جلاتے جایئے۔

کام یابی کا تعلق کسی کام کی تکمیل سے نہیں، اور کسی کام کو بہ ظاہر ادھورا چھوڑ کر جانے والا بھی کام یاب ہو سکتا ہے۔

رد عمل سے گریز

ہماری زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ رد عمل میں گزر جاتا ہے۔ انسان صبح اٹھتا ہے اور شام کر لیتا ہے، لیکن اس پورے دورانیے میں اس کے اپنے ایجنڈے پر کتنا کام ہوتا ہے اور دوسروں کے مسلط کیے ہوئے ایجنڈوں کی وہ کس طرح تکمیل کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ خود احتسابی کا بہت بڑا سوال ہے۔

انسان ایک وقت میں ایک ہی بڑا کام کر سکتا ہے۔ جب انسان کسی رد عمل میں مصروف ہو جاتا ہے تو یقیناً وہ اپنے ایک کام سے پیچھے چلا جاتا ہے، جو کام لے کر وہ آگے بڑھتا ہے، یا جو کام وہ کرنا چاہتا ہے، چاہے وہ اپنے لیے ہو، یعنی زندگی کے لیے ہو، اپنے مالی فائدے کے لیے ہو، اپنے مادی و انفرادی فائدے کے لیے ہو، گھر خاندان کے لیے ہو، دوست احباب کے لیے ہو، انسان کوئی نہ کوئی نیکی کرتا ہے، لیکن جب اس کے سامنے کوئی ایسا ہدف آجائے، یا کوئی ایسا شخص آجائے جو کسی بھی معاملے میں اس کو ٹوک دے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنا راستہ لینے کی بہ جائے اس کے جواب اور جواب در جواب کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ اگر کوئی ایسا مرحلہ ہو اس بارے میں سوچنے کے دو نکتے ہمارے سامنے ہونے چاہییں۔ پہلی بات یہ کہ جو بات کہی گئی ہے، وہ سچ ہے یا غلط۔ کیا وہ بات مفید ہے یا غیر مفید ہے؟ دوسری بات یہ ہے کہ اس کا رد عمل کیسا ہے؟ اس پر جو میں رد عمل دوں گا، وہ مفید ہو گا یا غیر مفید ہو گا؟ اس سے کوئی خیر پیدا ہو گی یا اس سے بڑھ کر شر پیدا ہونے کا اندیشہ ہے؟ عموماً ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ بات غلط ہوتی ہے، اس پر رد عمل کا ہمارا حق بنتا ہے، لیکن غور و فکر کے بعد سامنے یہ آتا ہے کہ رد عمل کے نتیجے میں وہ برائی جو اس شخص کے رد عمل سے پیدا ہوئی تھی، مزید پھیلے گی اور مزید وسعت اختیار کرے گی، تو اس صورت میں ہمیں رد عمل سے رکنا ہو گا۔ اس لیے ہمارا کام بنیادی طور پر کام کرنا، کام یابی کے لیے سفر کرنا اور کام یاب اور مطمئن زندگی کے لیے کوشش کرنا ہے۔ اگر ہم اپنے عمل سے برائی اور شر کے کسی عمل میں حصہ ڈال رہے ہیں، اس کو پروان چڑھانے کے ذمے دار بن رہے ہیں، اور اس کو پھیلانے میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنی صلاحیتیں صرف کر رہے ہیں تو اس صورت میں ہم اپنی زندگی کو کامیاب کیسے بنا سکتے ہیں؟ دوسروں کے راستے میں کانٹے بونے والے اپنے لیے کانٹوں سے صاف راستے کیسے مانگ سکتے ہیں؟

دنیا کا ایک بہت بڑا اصول ہے جو ہم میں سے ہر شخص نظر انداز کرتا ہے، وہ یہ کہ یہاں بھلائی صرف اس کو ملتی ہے جو دوسروں کے لیے بھلائی کرتا ہے اور بھلا سوچتا ہے۔ اس زندگی کا پورا نظام اللہ تعالیٰ نے اسی نکتے پر استوار کیا ہے۔ آپ کسی کے ساتھ نیکی کر کے دیکھیں، وہ آپ کے پاس لوٹ کر ضرور آئے گی۔ قرآن حکیم کی روشنی میں وہ ضرب پاتی رہتی ہے، مسلسل بڑھتی رہتی ہے۔ کسی معاشرے میں نیکی کا بڑھنا یہ ہے کہ وہ معاشرے کو مستفید کرتی رہتی ہے اور معاشرے میں اس نیکی کا پھیلاؤ مزید وسعت اختیار کر لیتا ہے، اور کسی وقت گھوم پھر کر اس شخص یا اس کے کسی بھی قریبی شخص تک وہ ضرور لوٹ آتی ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ سے کوئی ایک واقعہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بل کہ آپ کی پوری سیرت مبارکہ ردعمل سے گریز کا نام ہے۔ کسی بھی موقع پر اپنی بات کو پیچھے رکھ کر سامنے والے کو مطمئن کرنا، چاہے اس کی شکایت جائز ہو یا ناجائز، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا حاصل نظر آتا ہے۔ کوئی شخص سوال کرتا ہے، بدتمیزی کا مظاہرہ کرتا ہے، جس کا سبب اس کا اجڈپن بھی ہو سکتا ہے، اس کی لاعلمی بھی ہو سکتی ہے اور اس کا کوئی منصوبہ بھی ہو سکتا ہے۔ ایسے واقعات ملتے ہیں تو اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت ہی تحمل اور اطمینان سے اپنے رفقا کو یہ کہتے ہیں کہ اس کا یہ مطالبہ پورا کر دو۔ ردعمل کا کہیں تصور نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ رضی اللہ عنہم کے تعلق کو پیش نظر رکھ کر اندازہ کیجیے کہ انہوں نے ایسے مواقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ضبط سے کیا سیکھا ہوگا؟ اور آپ کے ضبط کو سامنے رکھ کر انہوں نے اپنے آپ کو کس طرح ضبط کرنے کی عادت ڈالی ہوگی؟ لیکن آج ہمارا رویہ اس کے بالکل برعکس ہے اور انتہائی دکھ کی بات ہے کہ اس برعکس رویے کو بھی ہم عین دین سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے!

نظر انداز کیجیے!

ہم جب اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں تو یہ روز کا دیکھا بھالا مشاہدہ ہے کہ راستے میں ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے سے پہلے اور منزل تک پہنچنے کے دوران کئی چیزیں ملتی ہیں۔ کچھ لوگ بھیک مانگتے ہوئے نظر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آتے ہیں، کچھ کچرا چنتے ہوئے نظر آتے ہیں، کچھ بلا وجہ بلا سبب راستے روکے ہوئے کھڑے بھی نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات راستے میں حادثات دیکھنے کا بھی موقع ملتا ہے، کہیں رکاوٹیں ہوتی ہیں، کہیں کام ہو رہا ہوتا ہے، کہیں کھدائی ہو رہی ہوتی ہے، کہیں سڑک کی مرمت ہو رہی ہوتی ہے۔ انسان ان تمام چیزوں کو دیکھتا ضرور ہے، لیکن ان تمام چیزوں سے گزر جاتا ہے۔

ایک اور چیز دیکھیے! بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ، خاص طور پر صبح کے دفتری اوقات میں، اور بڑے شہروں میں رہنے والوں کو راستے میں ٹریفک جام ملتا ہے۔ لوگ ان راستوں سے واقف ہوتے ہیں، ان کو علم ہوتا ہے کہاں رکاوٹ ہو سکتی ہے؟ اور یہ رکاوٹ جو نظر آ رہی ہے کتنی طویل ہو سکتی ہے؟ اس وقت وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ اگر مختصر رکاوٹ ہے اور یہ راستہ جلدی کھل جائے گا تو وہ صبر سے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر محسوس ہوتا ہے کہ یہ کوئی ان ہونی ہو رہی ہے، عام طور پر یہاں ایسی کوئی رکاوٹ نہیں آتی، لگتا ہے کہ یہ رکاوٹ ذرا طویل مدت تک چلے گی، تو راستہ بدل لیا جاتا ہے۔ یہ عملی زندگی کا پورا ایک چلن ہے۔ انسان اپنی منزل کو متعین کرنے کے بعد جب سفر کا آغاز کرتا ہے تو اس کو بہت سی چیزیں نظر انداز کرنی ہوتی ہیں۔ اگر وہ ان چیزوں کو نظر انداز نہیں کرے گا تو صبح ۸ بجے آفس کے لیے نکلنے والا شخص شام ۴ بجے تک سڑکوں پر ہی رہے گا، اپنے دفتر نہیں پہنچ پائے گا۔ کہیں رکاوٹ ہوگی، کہیں مسئلہ ہوگا، کہیں جھگڑا ہوگا، کچھ ایسے مناظر ہوں گے، جو انسان کی دل چسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ انسان ان سے ایسے نمٹتا ہے کہ اس کے مزاج میں ایک سینسر موجود ہے، جو اس کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ یہ میری دل چسپی کی چیزیں نہیں ہیں، مجھے ان سب چیزوں کو نظر انداز کرنا ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو روز مرہ کی چیزیں ہیں، لیکن ایک اور چیز بھی ہوتی ہے، یعنی بہ راہ راست آپ کو راہ چلتے رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑے، یعنی وہ رکاوٹ خاص آپ کو ٹارگٹ کرتی ہے، ایک شخص خاص آپ کا دامن تھام لیتا ہے، خاص آپ کے راستے کی رکاوٹ بن جاتا ہے، اس صورت میں بھی اگر کوئی شخص اپنے کام سے واقف ہے اور وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ مجھے ذمے داری دی گئی ہے اور اس ذمے داری کی مجھے تکمیل کرنی ہے تو وہ ان راستوں کی رکاوٹوں کو بھی نظر انداز کرتا ہے اور ایسے شخص کو بھی نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہے جو خاص اس کو ہدف بنا کر اس کے راستے میں کھڑا ہو جاتا ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوت کا آغاز کیا تو آپ عرب کے مختلف بازاروں اور قبائل میں جا جا کر صدا لگاتے تھے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قولو الا الہ الا اللہ تفلحوا

لوگو! ایک اللہ کا، ایک رب کی وحدانیت اور اس کے مالک وخالق ہونے کا کلمہ پڑھ لو، کام یاب ہو جاؤ گے، دین ودنیا کی ساری کام یابیاں اور کام رانیاں تمھاری جھولی میں آگریں گی۔

روایتوں میں واضح طور پر آتا ہے کہ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے آپ کے انتہائی قریبی شخص یعنی آپ کا سگا چچا آپ کے خلاف بات کرتے ہوئے نظر آتا ہے، نہ صرف یہ کہ بات کرتا ہے، بل کہ آپ کو تشدد کا نشانہ بنانے کی کوشش بھی کرتا ہے کہ لوگ آپ کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ [8] یہ ٹکراؤ ایک بہت بڑا عنوان بن سکتا تھا، انسان کو سب سے پہلے یہی دل چسپی ہوتی ہے کہ اس کے رشتے دار یا تو اس کا ساتھ دیں یا کم از کم اس کے راستے کی رکاوٹ نہ بنیں۔ یہ تو چچا سے ٹکرانے کا ایک بہت بڑا عنوان تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر انداز کر دیا، ان کی بات کو سنی ان سنی کر دیا۔ اپنے کام میں لگے رہے اور بالآخر کام یابی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم چومے۔

قرآن حکیم نے بھی بہت کمال کی بات کی ہے:

وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا [9]

جاہلوں کے منہ لگنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر ان سے کبھی ٹکراؤ ہو جائے تو انسان کو ایک ہی بات کہنی چاہیے کہ تم پر سلام ہو، ہمارا یہ منصب نہیں کہ تم سے بات کر سکیں۔ اعراض کرو، نظر انداز کرو اور اپنا راستے لے لو۔

صبر

انسان ہر واقعے پر ردعمل ظاہر نہیں کر سکتا۔ کہیں نہ کہیں اسے رکنا پڑتا ہے۔ انسانی مزاج یہ ہے کہ وہ بڑوں کے سامنے، خواہ وہ عہدے اور منصب میں بڑے ہوں، یا عمر اور مرتبے میں، عموماً خاموش ہی رہتا ہے، خواہ ان کی بات کتنی ہی بری لگے، اور خواہ وہ دل میں ان کی بات کو نہایت ناپسندیدہ ہی کیوں نہ سمجھتا ہو۔ اس کے برعکس چھوٹوں کے سامنے وہ ردعمل کھول کر دکھاتا ہے۔ اس میں تھوڑا سا فرق کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ اگر انسان کسی منصب اور ذمے داری پر فائز ہے اور انتظامی امور اس سے

۸۔ صحیح ابن خزیمہ: ج۱، ص ۸۲

۹۔ فرقان: ۶۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وابستہ ہیں، تو اس کے فرائض میں ضابطے کے مطابق سختی بھی شامل ہے، خواہ اس کا مزاج کس قدر نرم ہی کیوں نہ ہو، یہ اس کے منصب کا تقاضا ہے۔ لیکن ایسے افراد کو دوسروں کی بہ نسبت شاید زیادہ صبر کی نوبت آتی ہے۔ قرآن کریم نے صبر کی بہت تلقین کی ہے، مگر صبر ہے کیا؟ صبر ہمارے ذہن میں موجود تصور کے مطابق ہمتیں پست کرنے اور ہتھیار ڈال دینے کو کہتے ہیں، یہ صبر کا نہایت غلط تصور ہے، صبر کہتے ہیں فوری ردعمل سے اپنے آپ کو روک دینا۔ اپنے قدم جمانا، اپنی صلاحیتیں یک جا کرنا، حوصلے بہ حال کرنا اور اپنے وسائل دوبارہ اکھٹے کر کے اپنے آپ کو دوبارہ بھرپور طریقے سے سرگرم کرنے کے لیے تیار کر لینا۔

قرآن کریم کی جس قدر آیات میں صبر کا مفہوم مختلف حوالوں سے بیان ہوا ہے، ان کا خلاصہ یہی ہے۔

انسان جب حالات کے سامنے زچ ہو جاتا ہے، اور اپنے سامنے عمل کی کوئی کھڑکی کھلی نہیں پاتا، تب صبر کا مرحلہ شروع ہوتا ہے، اب وہ اچھے حالات، مناسب مواقع اور درست وقت کا انتظار کرتا ہے، اور اس سلسلے میں اپنے پاس موجود وقت کا درست استعمال کرتے ہوئے اپنی صلاحیتیں اور وسائل اکھٹے کرتا ہے، منصوبہ بندی کرتا ہے، نئے امکانات کا جائزہ لیتا ہے، اور ٹیسٹ میچ کے اچھے بیٹسمین کی طرح کم زور گیند کا انتظار کرتا ہے۔

یہ کم زور گیند اسے اسی اوور میں بھی مل سکتی ہے، اور اس کے لیے کئی اوور مسلسل خالی بھی گزارنے پڑ سکتے ہیں، مگر اس دوران سب سے اہم کام اپنی وکٹ بچانا ہوتا ہے، یہی صبر ہے۔ ہمیں اپنے اپنے مقام پر ردعمل سے گریز کرتے ہوئے، اپنی صلاحیتیں بچانا ضروری ہے، تاکہ جب وہ مناسب اور کم زور گیند کسی بولر کے ہاتھ سے نکلے تو اسے باؤنڈری سے باہر پھینکنے کے لیے ہم کریز پر تو موجود ہوں۔

ہماری غلطی یہ ہے کہ ہم ٹیسٹ میچ میں بھی ٹی ٹوئنٹی کا تجربہ کرنا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا اٹھایا ہوا قدم خود ہمارے ہی گلے پڑ جاتا ہے، اور پانچ دن کا ٹیسٹ میچ ڈیڑھ دن میں ختم ہو جاتا ہے۔

جناب رسول اکرم ﷺ نے اپنے عمل سے صبر کی ہر ہر لمحے تلقین فرمائی ہے۔ اور اس کے لیے کسی ایک واقعے کی نشان دہی ضروری نہیں۔ پوری سیرت طیبہ ہی اس کی عکاس ہے۔ آغاز وحی سے لے کر وقت رخصت تک جن چند صفات کا آپ ﷺ سے مسلسل ظہور سامنے آتا ہے، ان میں ایک صبر بھی ہے۔

صبر کی اسی اہمیت کو ہم اپنی عملی زندگی کا حصہ بنا کر کام یاب زندگی کے بہت سے ثمرات حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمارا فوری ردعمل، ہر ناپسندیدہ واقعے پر اپنے جذبات کا اظہار اور معمولی سی بات پر غیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معمولی ردعمل سب مزاج کی شدتیں اور غصے کی وہ لپٹیں ہیں، جو خود ہمیں جلاکر بھسم کردیتی ہیں، اور ہمیں احساس تک نہیں ہوتا۔

نرمی

انسانی مزاج مختلف ہوتے ہیں، پھر ماحول بھی مزاج کی ساخت پر اثرانداز ہوتا ہے، اس اعتبار سے انسانوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، سخت اور نرم۔ لیکن یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں، انسانی مزاج کی پیچیدگی ایسی کسی تقسیم سے ہمیں باز رکھتی ہے، کیوں کہ مشاہدہ یہ ہے کہ سختی کو نرمی میں بدلتے اور نرمی کو سختی کا روپ دھارتے دیر نہیں لگتی۔ قصہ یوں ہے کہ انسانی مزاج پر بہت سی چیزیں اثرانداز ہوتی ہیں، اور سختی اور نرمی ان ہی کے اثرات اور ردعمل سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن انسان کی اصل نرمی ہے، کیوں کہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مل جل کر رہنے کا ٹاسک دیا گیا ہے، اور یہ عمل نرمی کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔

یہی بات رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمائی:

جو شخص نرمی سے محروم ہے وہ بھلائی سے محروم ہے۔ (۱۰)

دوسری روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نرمی کو اللہ تعالیٰ کی صفت قرار دیا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نرمی اور نرم دلی پر بیش بہا انعامات فرماتے ہیں۔ فرمایا:

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نرم خو ہے اور نرمی کو پسند کرتا ہے، اور نرم خوئی پر انسان کو وہ کچھ عطا کرتا ہے جو وہ نہ تو سختی پر عطا کرتا ہے نہ اس کے علاوہ کسی اور چیز پر۔ (۱۱)

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے انسان کو جن اچھے اخلاق کی تعلیم دی ہے، اور جن صفات کو اپنانے کی تاکید کی ہے ان میں سے ایک اہم صفت نرم دلی ہے، یہ ایک فطری صفت ہے جو پیدائشی اور خلقی طور پر انسان میں رکھ دی گئی ہے، کیوں کہ نرم دل شخص صرف ایک اچھی صفت کا ہی حامل نہیں ہوتا بل کہ وہ بہت سی عمدہ صفات کا جامع ہوجاتا ہے، جن میں ہم دردی، خیر خواہی، رحم دلی، خدمت خلق، سخاوت اور شجاعت وغیرہ شامل ہیں۔

۱۰۔ مسلم: ج ۴، ص ۱۸۲، رقم ۲۵۹۲

۱۱۔ مسلم: رقم ۲۵۹۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ ایک صحابیِ رسول ہیں، وہ ایک وفد کے ہم راہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تھے اور کئی روز تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پر رونق و بابرکت مجلس سے فیض یاب ہوتے رہے، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رحیم المزاج اور رقیق القلب تھے۔ (۱۲)

نرمی کے نتیجے میں انسان سہولت کے ساتھ وہ اہداف بھی حاصل کرلیتا ہے، جو سختی کے نتیجے میں مشکل تر ہوجاتے ہیں۔ انتظامی امور میں کی جانے والی سختی الگ نوعیت رکھتی ہے، مزاج کی سختی بالکل الگ چیز ہے، اس لیے اوپر بیان ہونے والی روایت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نرمی کو تمام خوبیوں کی بنیاد قرار دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کام یاب انسان کی نمایاں صفات میں نرمی اور نرم دلی واضح اور امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

خاموش منصوبہ بندی

کام یابی کے لیے منصوبہ بندی کی اہمیت سے کسی سمجھ دار شخص کو انکار نہیں ہوسکتا، اور منصوبہ بندی خاموشی سے ہی ہوتی ہے، لوگوں کے سامنے منصوبہ نہیں، اس کے اثرات آتے ہیں، اور آنے چاہییں۔ ہمارا معاملہ اگرچہ مختلف ہوگیا ہے، ہم خود منصوبہ بندی کو ہی پھیلا کر اور عام کر کے سمجھتے ہیں کہ ہم کام یاب ہوگئے، اور پھر نتائج و اثرات سے بالکل بے پروا ہوجاتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ میں ہمیں خاموش حکمتِ عملی اور خاموش منصوبہ بندی کا تصور بھی واضح طور پر ملتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سے زائد مواقع پر ایسی کاوش فرمائی کہ مستقبل میں اٹھنے والے خطرے کے امکانات کو دیکھتے ہوئے پہلے ہی ان کا راستہ روک دیا، اور پیدا ہونے سے پہلے ہی فتنے کا دروازہ بند کردیا۔

ہجرت مدینہ پر بہت لکھا گیا ہے، اس کے فوائد اور اثرات و ثمرات پر بہت تفصیل سے بات کی جاسکتی ہے، مگر اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت بعد میں واضح ہونے والے خطرے کا پہلے ہی سدباب فرمادیا۔ مدینہ منورہ کا علاقہ بھی مکے کی طرح قبائلی علاقہ تھا، قبائل کی اپنی الگ ہی دنیا ہوتی ہے، وہاں تہذیبی اور تمدنی حوالے سے زرا سے فرق کو بھی بعض اوقات تسلیم نہیں کیا جاتا،

۱۲۔ مسلم: ج ۱، ص ۳۰۷، رقم ۶۷۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی لیے وہاں دوسرے قبیلے میں رشتے داریاں نہیں ہوسکتیں، رہنے کے علاقے بھی قبائلی بنیاد پر تقسیم ہوتے ہیں، صرف زبان کو نہیں اس کے علاقائی لہجے کو بھی خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ یہی فرق اہل مکہ اور اہل مدینہ میں بھی کئی حوالوں سے موجود تھا، یہ فرق ہجرت مدینہ کے بعد مکے سے آنے والے مہاجروں اور مدینے میں ان کو خوش آمدید کہنے والے انصار میں کسی ٹکراؤ کا سبب بن سکتا تھا، اسی خطرے کو آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عرصہ پہلے بھانپ لیا، اور اس کے لیے ایک خاموش منصوبہ تیار کیا، جسے مواخات کہتے ہیں، بھائی چارا۔ ایک مہاجر کو ایک انصاری صحابی کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھائی قرار دیا، اور انہیں باہم اخوت کے رشتے میں پرو دیا۔ اس منصوبے کے فوری نتائج تو معاشی اور نفسیاتی تھے۔ مکے سے سب کچھ راہ خدا میں لٹاکر آنے والوں کی تنہائی دور ہوئی، انہیں معاشرتی اور سماجی تحفظ حاصل ہوا۔ وہ نئے سرے سے متحرک ہوکر معاشرے کو کچھ دینے کے قابل ہوئے۔ لیکن اس کا ایک اہم پہلو بڑا دور رس تھا، اور بعد میں پیش آنے والے واقعات نے ثابت بھی کیا کہ یہ قدم کس قدر ضروری اور بروقت تھا، اگر یہ مواخات پہلے سے موجود نہ ہوتی تو بعد کے حالات پر قابو پانا آسان نہ ہوتا۔ چناں چہ اسی مدینے میں ایک وقت ایسا آیا جب منافقین کی شرارتوں اور سازشوں کی وجہ سے مہاجر و انصار کو مدمقابل لانے کی کوشش کی گئی، اور یاللمہاجر اور یاللانصار کے نعرے بلند ہوئے۔ لیکن محض چند لمحے میں، محض جناب رسول اللہ علیہ وسلم کی ایک تقریر نے فضا صاف کردی، بات واضح ہوگئی، اور شرارت ناکام۔[۱۴]

یہ خاموش حکمت عملی ہے، یہ ہماری کام یابی کی بنیاد ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم مستقبل پڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، اور یہ جانتے ہوں کہ ان خطروں کو پیدا ہونے سے پہلے ہی کیسے روکا جاسکتا ہے۔

یہ حکمت عملی جس طرح قوموں اور ریاستوں یا حکومتوں کے لیے ضروری ہے، اسی طرح فرد کے لیے بھی ضروری ہے۔ فرد کو بھی اپنی اپنی سطح پر اپنی اپنی ذمے داریوں کے ساتھ ایسے مسائل پیش آتے ہیں، جن میں اس کو مختلف محاذوں پر لڑنا پڑتا ہے، یہ محاذ میدان جنگ والے نہیں ہوتے، یہ چھوٹے

۱۴۔ بخاری: ج ۳، ص ۳۰۶، رقم ۴۹۰۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چھوٹے چیلنج ہوتے ہیں، جو کبھی انتظامی طور پر، کبھی سماجی اور معاشی صورت میں تو کبھی خانگی نوعیت کے ہمیں روز پیش آتے ہیں۔

یہاں جنگ کا لفظ بھی وسیع معنیٰ میں استعمال ہوا ہے، یہ جدوجہد کے معنیٰ میں ہے، اور انسان دنیا میں آنے کے بعد واپس لوٹنے تک اسی جدوجہد سے گزرتا رہتا ہے۔

مشورہ

انسان اپنی کامیابی کے لیے جب زیادہ فکر مند ہوتا ہے تو یقیناً دوسروں سے مشورہ ضرور کرتا ہے۔ بہت کم صورتوں میں ایسا ہوتا ہے کہ انسان مشورے کی اہمیت کا قائل نہ ہو۔ انسان کی ایک تو معلومات بڑی محدود ہیں۔ تعلیمی ذرائع کتنے ہی میسر ہوں، ہر انسان ایک محدود دائرے میں ہی سیکھ پاتا ہے، پھر انسان کے سیکھے ہوئے حصے کو محفوظ کرنے کے بھی انسانی ذہن میں دو خانے ہوتے ہیں، کچھ چیزیں وہ ہوتی ہیں جو انسان کو ہر وقت یاد رہتی ہیں، کچھ چیزیں انسان کے ذہن سے بہ ظاہر محو ہو جاتی ہیں، البتہ اس کے نچلے حصے میں محفوظ ہوتی ہیں، ان کو یاد دلانا پڑتا ہے۔ یہ مشورے کی برکت ہے کہ ایک تو وہ باتیں جو اس کے علم میں نہیں ہوتیں وہ دوسروں کے ذریعے سے سیکھ لیتا ہے، اور جو باتیں اس کے ذہن میں تو ہوتی ہیں لیکن وقتی طور پر وہ انہیں بھول چکا ہوتا ہے، وہ بھی مشورے کی برکت سے اسے یاد آجاتی ہیں۔ اس لیے انسان کا مشورے میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حوالے سے کئی اہم باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ اگر کوئی شخص آپ سے مشورہ لے تو اس صورت میں ہر ایک کو درست مشورہ دینے کا پابند کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس صورت میں مشورہ دینے والا امین ہے۔ (۱۴)

اس کو مشورہ اسی طرح امانت کے طور پر پیش کرنا ہے جس طرح امانت میں پوری رازداری برتنا ضروری ہے، اسی طرح مشورے میں بھی دیانت اور رازداری ضروری ہے اور یہ بات اس تک محدود رہے، یہ نہ ہو کہ پورے محلے اور قبیلے تک ہر بات پہنچ جائے۔ دوسرے امانت جس انداز سے رکھوائی ہے پوری دیانت سے اسی انداز سے وہ رقم بہ وقت ضرورت اس کے طلب پر لوٹا بھی دے۔ اسی طرح مشورے میں بھی انسان بہت سی باتیں ایسی کہتا ہے کہ وہ ان کی تشہیر اور ان کو عام لوگوں تک پہنچانا پسند

۱۴۔ طبرانی۔ المعجم الکبیر: ج ۶، ص ۲۱۹، رقم ۶۹۱۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں کرتا۔ اب جس سے مشورہ لیا جارہا ہے، اس کی ذمے داری ہوگی کہ وہ ان باتوں کو اپنے آپ تک محدود رکھے اور پھر اپنی دیانت دارانہ رائے اس کے سامنے پیش کردے۔ اس میں مشورہ دینے والے کو اپنی پسند ناپسند اور اپنی دل چسپی سے زیادہ اس نکتے سے دل چسپی ہونی چاہیے کہ مشورہ دینے والے کا کس پہلو سے کیا فائدہ ہوسکتا ہے؟

اس مشورے کے اس قدر اہمیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تک فرمایا کہ آپ اپنے صحابہ کرام کو مشورے میں شریک رکھیں:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ [15] یہ قرآن حکیم کا حکم ہے۔ دوسرے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی جماعت کی تعریف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کی قابل تعریف صفت ہے:

وَأَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ [16]

وہ اپنے امور باہم مشاورت سے طے کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تو مشورے کی اس قدر اہمیت ملتی ہے کہ ایک سے زائد مواقع ایسے ہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسروں کے کہنے پر اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت کے فیصلے پر اپنی رائے پیچھے کرلی اور عمل کرنے کے لیے اس رائے کا انتخاب کیا، جس کی طرف اکثریت کا رجحان بنتا تھا۔

ایک چیز ذہن میں رہنی چاہیے کہ مشورے کا مقام کیا ہے؟ مشورہ ایک رائے ہے، ایک تجویز ہے، ایک خیال ہے۔ مشورہ آپ کے سامنے اس کام کی کئی جہتیں پیش کرتا ہے، جس کے بارے میں مشورہ کیا جارہا ہے، کئی راستے کھولتا ہے، لیکن اس میں سے کس راستے کا انتخاب کرنا ہے، وہ حتمی طور پر آپ کے ہاتھ میں ہوگا، البتہ مشورے سے آپ کو یہ مدد ملے گی کہ آپ بہت سے راستوں میں سے کسی ایک راستے کا انتخاب کرسکیں۔

۱۵۔ آل عمران:۱۵۹

۱۶۔ شوریٰ:۳۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعلق قائم رکھیے

ہماری اس عملی زندگی میں کئی مراحل ایسے آتے ہیں، جب انسان کے تعلقات ٹوٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ معاملہ فرد کے ساتھ بھی ہوتا ہے، قوموں کے ساتھ بھی ہوتا ہے، تنظیموں کے ساتھ بھی ہوتا ہے، گروہوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ جب یہ ٹوٹنے کا مرحلہ آتا ہے تو چوں کہ تعلق ٹوٹنے کا مفہوم ہے کہ دلوں میں دراڑیں پڑ چکی ہیں، اس لیے اس کے نتیجے میں انسان ایک نفسیاتی ردعمل کے دباؤ میں آجاتا ہے اور یہ ردعمل انسان کو جس سے تعلق ختم ہو رہا ہے دور اور دور سے مزید دور دھکیلتا ہوا لے جاتا ہے۔ انسان جب دور ہونے لگتا ہے تو ظاہر ہے کہ بہت سی غلط فہمیاں، بہت سے اشکالات اور بہت سی شکایتیں مزید بڑھنے لگتی ہیں اور جو نقطہ تعلق ٹوٹنے کا سبب بنا تھا وہ نقطہ نہیں رہتا، وہ نقطہ پھیل کر ایک پوری کتاب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ وہ ایک بیج تھا تو بیج نہیں رہتا، وہ ایک تناور درخت بن جاتا ہے اور پھر دونوں افراد یا دونوں گروہ ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جب انسان دوریوں پر آتا ہے اور اپنے عمل کے ذریعے دوریاں مزید بڑھانے لگتا ہے تو خاص طور سے وہ گروہ جو کم زور ہوتا ہے، وہ بالکل یکا و تنہا ہو جاتا ہے، آئسولیٹ ہو جاتا ہے۔ یہ آئسولیشن اس کے لیے بھی اور اکثریتی طبقے کے لیے بھی، یا اگر چھوٹا سا کوئی انتظامی یونٹ ہے، دفتر ہے، تو اس میں سینئر پوسٹ کے لوگ ہوں یا جونیئر سطح کے، ان میں سے کسی بھی طبقے کے لیے یہ مرحلہ تشویش ناک اور خطرناک ہوتا ہے۔ ہم پھر وہی بات کہیں گے کہ انسان مدنیت طبع ہے۔ اس کا مزاج مل کر، جم کر، جمع ہو کر اجتماع سے بنا ہے، وہ اپنے کام تنہا انجام نہیں دے سکتا، اس کو ملنا پڑتا ہے۔ اس کی ساخت، بل کہ اس کا خمیر ہی اجتماع سے اٹھا ہے، تو ایسی کیفیت میں کسی ایک طبقے کا مرکزی دھارے سے علیحدہ ہو جانا، ایک شخصیت کا علیحدہ ہونا نہیں ہوتا، اس کے اثرات پورے معاشرے یا اس کے گرد موجود پورے ماحول پر پڑتے ہیں۔ یہی حال تنہا ایک فرد کا بھی ہے۔

انسان کے مدنی طبع ہونے کا ایک واضح مفہوم یہ بھی ہے کہ اس کی تمام اچھائیاں اور تمام برائیاں پورے معاشرے پر اثر انداز ہوتی ہیں، اور جب معاشرے پر اثر انداز ہوتی ہیں تو اس کا مفہوم بڑا واضح ہوگا کہ ان سے ہر انسان متاثر ہو رہا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ آنے کے بعد سب سے پہلے لوگوں سے روابط قائم کیے اور روابط قائم کرنے کے لیے آپ نے دو تین طریقے کار اختیار کیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطوط اور سفارتوں کے ذریعے سب سے رابطے کیے۔ لوگوں کے پاس اپنے وفود بھیجے، اور ان سے باہمی امور پر معاہدے کرنے کی کوشش کی۔ یوں آپ ﷺ ان معاہدوں کے ذریعے اطراف کے افراد و قبائل اور حکومتوں کو اتحاد و اتفاق کی لڑی میں پروتے چلے گئے۔ یہ کیفیت آج ہمیں بہت سے سبق فراہم کرتی ہے اور ہمیں ایک ایسا لائحہ عمل عطا کرتی ہے، جس کے نتیجے میں ہم مل کر اور جڑ کر رہنے کا سبق سکتے ہیں۔ کوئی ہم سے ٹوٹنا بھی چاہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہمیں یہ ذمے داری عطا کرتی ہے ہم ان کو ٹوٹنے نہ دیں، بل کہ ان کو ملا کر رکھیں، جوڑ کر رکھیں، اکٹھا کر کے رکھیں۔ یہ عمل معاشرے کی ضرورت تو ہے، مگر یہ سب سے پہلے ہماری اپنی ضرورت ہے۔ یہ کام ہمیں اپنے لیے کرنا ہے۔

تعلقات

ہماری زندگی کی کام یابی اور ناکامی کا بہت بڑا دارومدار تعلقات پر بھی ہے۔ ہمارے تعلقات ہی وہ بہت بڑی بنیاد ہیں جو ہمیں خوشی، مسرت اور کام یابی فراہم کرتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سیرت مبارکہ میں آج سے ساڑھے چودہ سو برس پہلے اس کی طرف توجہ دلائی۔ بار بار پیرایہ بدل کر، مختلف حوالوں سے رشتوں کو سمجھنے اور ان کا حق ادا کرنے کی تلقین فرمائی۔

آج کل تحقیق کا زمانہ ہے، اور انسان بغیر دلیل کے کوئی بات ماننے کو تیار نہیں ہے۔ یہ آج کی تحقیق ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی کی ایک رپورٹ سے ہمیں علم ہوتا ہے کہ کام یابی اور دلی مسرت انسان کے تعلقات سے جنم لیتی ہے۔ اس تحقیق کے تحت ۷۲۴ افراد کے ایک گروپ کو مسلسل ۷۵ سال تک مشاہدے، تجربے اور تحقیق کا موضوع بنایا گیا، تاکہ اس بات کا یقین ہو سکے کہ انسان کی دلی مسرت اور کام یابی کا دارومدار کس بات پر ہے؟ ۷۵ سال تحقیق کرنے کے بعد انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ انسانی خوشی اور کام یابی کا تعلق نہ دولت سے ہے، نہ شہرت سے ہے، بل کہ انسان کے درمیان قائم تعلقات سے حاصل ہونے والی طمانیت سے ہے۔ یہ طمانیت اور اطمینان انسان کو کیسے ملتا ہے؟ ان تعلقات کو برقرار رکھ کے، ان کی برقراری کے لیے جدوجہد کر کے اور ان تعلقات کے نتیجے میں دوسروں کو خوشی، مسرت، آسائش، اور آرام و سکون اور دلی تعلق پیش کر کے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رشتے داروں کو ان کے حقوق کے حوالے سے یاد فرمایا، پڑوسیوں کو ان کے حقوق کے حوالے سے یاد فرمایا۔ پھر رشتے داریوں میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے درجہ بندی فرمائی۔ جو سب سے زیادہ قریب ہے، اس کو اسی قدر زیادہ حق دار قرار دیا گیا، پھر اس کو درجہ بہ درجہ آگے لے جاکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام رشتوں کو تعلق کی ایک ایسی لڑی میں پرو دیا، جس کو متاثر کریں گے تو پورا معاشرہ متاثر ہوگا۔ اس میں ایک نکتہ اور اہم ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رشتے داری اور تعلق کو قانونی شکل بھی دی، اور دنیاوی اعتبار سے کہ لیں کہ مادی شکل بھی دے دی۔ رشتے داروں کا دور تک تعلق بھی بسا اوقات وراثت میں حق دار ہونے کا سبب بنتا ہے، جس کی بہت سے مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اس میں والدین کی دونوں جانب سے تیسری پشت میں اور کبھی چوتھی پشت میں جاکر بھی انسان وارث بنتا ہے۔ تیسری پشت کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ انسان اپنے دادا کے والد کو بھی جانتا ہو، کیا آج کے زمانے میں یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ انسان اپنے دادا کو، اور دادا کے والد کو اور ان کی اولادوں کو نہ صرف جانتا ہو، بل کہ ان سے تعلق بھی استوار رکھتا ہو۔ اسلام نے یہ بات کی، جب انسان کو دنیاوی فرائض میں یہ ہلکی سی امید ہوگئی کہ کہیں سے اس کو ملی مفاد بھی میسر آسکتا ہے تو خود سوچیے کہ وہ کس دل چسپی کے ساتھ اس تعلق کو استوار کرے گا، اور پھر جب اس تعلق کا ایک روحانی پہلو یہ ہو کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تعلقات کو برقرار رکھنے اور ان کا حق ادا کرنے کی تلقین فرمائی ہے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انسان کس سرگرمی سے، کس تگ و دو سے اس تعلق کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے گا، لیکن ہمارے لیے اس تعلق کا سب سے بڑا عنوان یہ ہے کہ یہ تعلق ہماری کام یابی کی شاہ کلید ہے۔

راستہ دیجیے

کام یابی کے لیے ہمیشہ ٹکراؤ مفید نہیں ہوتا، اس عمل سے الٹا نقصان اور مسلسل نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایسے حالات ہوجاتے ہیں کہ معاملہ انا پر آکر اٹک جاتا ہے۔ ہم اور ہمارا مد مقابل دونوں ایسے نکتے پر آجاتے ہیں، جہاں انا کے ٹکراؤ کے علاوہ کوئی صورت نظر نہیں آتی، فریق کے لیے عزت اور ناک کا مسئلہ اہم ہوتا ہے، چاہے اس کے لیے کتنا ہی نقصان اٹھانا پڑے۔ ایسی صورت میں دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۔ یا تو ہم اٹک جائیں اور مخالف کی انا کو توڑے بغیر اپنی جگہ سے ایک قدم بھی پیچھے ہٹنے پر تیار نہ ہوں۔ یہ بھی عمل کی ایک صورت ہے، اور ممکن ہے کہ یہ طریقہ اختیار کر کے ہم کامیاب بھی ہو جائیں۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کی انا کو توڑے بغیر دوسرے فریق کو اس معاملے سے نکلنے کا رستہ دے دیا جائے، ایسا صاف اور واضح راستہ، جس پر مقابل فریق چل کر تصور کرے کہ اس کی بات رہ گئی ہے، اور اس کی انا کو زک نہیں پہنچی۔ اس صورت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ بات ٹل جائے گی، وقتی طور پر سہی لڑائی بھی ختم ہو جائے گی اور پھر ایک مدت تک وہ آپ کے مقابلے میں کھڑا نہیں ہوگا۔

جب کہ پہلی صورت میں جب مقابل کو ہم نے شکست پر مجبور کر دیا تو وہ زخم خوردہ دشمن ہوگا، اور زخم کھایا ہوا دشمن نہ خود چین سے بیٹھتا ہے، نہ دوسرے فریق کو چین سے بیٹھنے دیتا ہے۔ اور دشمن کا چین سے نہ بیٹھنے کا مطلب ہوتا ہے کہ آپ کے چین اور سکون میں بھی کمی واقع ہو سکتی ہے، وہ اپنی شکست کی چبھن محسوس کرتا رہے گا اور بدلہ لینے کے لیے سازشوں اور شرارتوں میں مصروف رہے گا، اور اپنی ہاری ہوئی انا کی بحالی کے لیے نئے سرے سے کوششوں میں جت ہو جائے گا۔

اس سارے عمل میں سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ہماری مثبت تعمیری سرگرمیاں رک جاتی ہیں، دفاعی پوزیشن پر آ کر انسان اپنی حفاظت کی تگ و دو میں مصروف ہو جاتا ہے، تو وہ اپنے کام سے دور ہو جاتا ہے، اس کے برعکس جب مد مقابل کو محفوظ راستہ دے دیا جاتا ہے، اور وہ اپنی شکست محسوس کیے بغیر برابر کی سطح پر واپس لوٹ جاتا ہے، تو اس کی جانب سے فوری ردعمل کا امکان نہیں رہتا۔ امن کا یہ دورانیہ حکمتِ عملی سے مزید بڑھایا جا سکتا ہے، اور تعلقات بہتر کیے جا سکتے ہیں۔ اس دوران انسان اپنی دفاعی پوزیشن بھی بہتر کر لیتا ہے، اور تعمیری سرگرمیوں میں سرگرم ہو سکتا ہے۔

ہم ایک بار پھر صلح حدیبیہ کا مطالعہ کرتے ہیں، وہاں اس حوالے سے بھی ہمارے لیے سبق موجود ہے، وہاں یہی صورت حال تھی کہ قریش مکہ زچ ہو چکے تھے، ان کے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا۔ صرف انا کی جنگ تھی، ورنہ ان کے سامنے یہ روایت موجود تھی کہ حالتِ احرام میں قربانی کے جانوں ساتھ لانے والوں کو عمرے اور زیارت سے روکا نہیں جاتا تھا، بل کہ یہ عمل نہایت ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا، دوسری جانب مسلمانوں سے لڑائی ان کے لیے غیرت کا مسئلہ بن چکی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس تذبذب کو بھانپ لیا اور ان کی انا کو توڑے بغیر انہیں ایک محفوظ راستہ دے دیا، صلح نامۂ حدیبیہ دراصل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کے لیے ایک محفوظ راستہ تھا، اس لیے اس صلح کی سخت ترین شرائط بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کرلیں، کہ آپ کے سامنے مقصد بہت بڑا تھا۔

اس کے بعد مسلمانوں کو مشرکین کی جانب سے مکمل اطمینان حاصل ہوگیا، اور وہ یک سو ہو کر اپنی دعوتی اور دیگر ریاستی سرگرمیوں میں مصروف ہوگئے۔

جذبات کا اظہار

انسانی کائنات میں انسانی روابط اس کائنات کے وجود اور اس کی ساخت کا حصہ ہیں۔ انسان کے کچھ قریبی رشتے ہوتے ہیں، والد، والدہ، بہن، بھائی، بیوی، بچے، چچا، پھوپھیاں، خالہ، ماموں وغیرہ، یہ تمام رشتے اس کائنات کے وجود میں اللہ تعالیٰ نے سمودیے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ گوندھ دیے ہیں، دنیا میں آنے والا کوئی شخص ان رشتوں سے ماورا نہیں ہوسکتا، نہ کوئی شخص ان رشتوں کو نظر انداز کرکے اپنی زندگی کو خوش گوار بنا سکتا ہے۔ ان رشتوں کے ساتھ ایک رشتہ ان سے بڑھ کر، ان سے پہلے، اور ان سب سے زیادہ انسان کا اپنے خالق سے رشتہ ہے، انسان اس رشتے کو دل سے تسلیم کرتا ہے، اب صرف یہ مرحلہ رہ جاتا ہے کہ وہ اپنے خالق کو اسی حیثیت میں، ان ہی آداب کے ساتھ تسلیم کرتا ہے جیسے خالق چاہتا ہے، یا اس کو اپنے رسوم ورواج، اس کی معاشرت، اس کا علم، بل کہ لاعلمی اور جہالت اس کو کوئی اور شکل دے دیتی ہیں، لیکن اس ضرورت کو ہر انسان محسوس کرتا ہے اور عام طور پر اپنے اس احساس کو اظہار کی کوئی شکل بھی ہر انسان عطا کرتا ہے، ان تمام رشتوں کو نبھانا ہی کام یا زندگی کی ایک علامت ہے۔

ان تعلقات کو نبھانا انسانی جذبات سے تعلق رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو جذباتی اس لیے بنایا ہے کہ وہ ان رشتوں کو نبھا سکے، اور رشتے اس لیے بنائے کہ اس کا احساس تنہائی ختم ہو اور وہ دوسروں کے ساتھ مل کر رہنا سیکھے۔ ورنہ انسان جس قدر خود غرض ہے، اس سے یہ امید ہی نہیں کی جاسکتی کہ وہ بلاوجہ اور کسی سبب کے بغیر کسی سے ملنا بھی گوارا کرے گا۔ یہ سب جذبات کا کرشمہ ہے، اور جذبات اندر کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں، یہ دکھائے نہیں جاسکتے۔ کسی سے محبت ہے یا نہیں ہے، یہ دکھانے کی بات ہی نہیں، یہی معاملہ نفرت کا ہے۔ اس کا اظہار تو انسان کے عمل سے ہونا چاہیے، انسان دنیا میں اپنے جذبات کے اظہار کے لیے کچھ رشتے داروں کا محتاج ہے، کچھ اشارے ایسے ہوتے ہیں، جن سے انسان کی عقیدت وابستہ ہوجاتی ہے یا کردی جاتی ہے، مثلاً کسی حکومت یا ریاست کے شعار، یعنی ترانا، اور جھنڈا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وغیرہ، یہ چیزیں اس ملک کی علامات ہیں، اس لیے وہ قابل احترام ہیں، اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی محبت کے اظہار کے لیے کچھ اشارے مقرر کیے ہیں، ان میں نماز ہے، قربانی ہے، اور سب سے بڑھ کر حج ہے، جو مکمل طور پر عبودیت کا اظہار ہے۔ اس لیے اس میں ایسی علامات رکھ دی گئی ہیں، جو انسان میں ایک سرشاری کی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں، جب اللہ تعالیٰ کی ذات سے وابستہ ہونے کے باوجود یہ اظہار ضروری ہے، جو ذات مکمل بے نیاز اور بے پرواہ ہے، تو دنیا کا کوئی اور تعلق اظہار سے بے پروا کیسے ہو سکتا ہے؟ کیوں کہ اس اظہار کے ذریعے ہی دوسروں کو پیغام ملتا ہے، اور جذبات کا پیغام کبھی خالی نہیں لوٹتا، یہ احساس کو ضرور منتقل کرتا ہے، یہ جذبہ اظہار کے ذریعے ضرب پاجاتا ہے اور دو سے چار ہونے کا عمل شروع ہو جاتا ہے، اور پھر لوٹ کر اسی انسان کے پاس آجاتا ہے، اس لیے ایسے جذبات کے اظہار کو انسانی زندگی میں خاص اہمیت حاصل ہے، اس لیے ہماری بنیادی دنیاوی ضرورتوں میں قریبی عزیزوں اور رشتوں سے تعلق کا اظہار شامل ہے۔ یہ اظہار مل کر بھی ہوگا، ہاتھ ملا کر اور گلے لگا کر بھی ہوگا، محبت کے دو بول کر بھی ہوگا، تحفہ تحائف دے کر اور لے کر بھی ہوگا، لیکن سب سے بڑھ کر اظہار یہ ہوگا کہ جس سے آپ کا یہ رشتہ ہے اس کی ضرورت کا خیال رکھا جائے۔ یہ تمام باتیں ہمیں سیرت طیبہ سے معلوم ہوتی ہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جس سے جو بھی رشتہ تھا اس کو نبھایا اور خوب نبھایا اور نبھانے کا جو اعلیٰ ترین پیمانہ ہو سکتا تھا، آپ ﷺ نے اسے اپنایا۔ آپ اٹھ کر گلے ملے ہیں، سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا ہے، ان کے ساتھ کھایا پیا ہے، ان کی خوشی غمی میں شریک رہے ہیں، رشتوں کو پہچان کر محض رشتے کی نسبت سے پذیرائی کی ہے، جو سہولت دے سکتے تھے، وہ خود ہی دی ہے، یا صحابہ کرام سے دلوائی ہے، اور دوسروں کو بھی یہی تلقین کی ہے۔

انتخاب کیجیے

کاروبار ہو، ملازمت ہو، لڑائی و اختلاف کی صورت ہو، یا دوستی کا ماحول ہو، کوئی بڑا اقدام اٹھانا ہو، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک دوراہے پر کھڑا ہے، اسے کسی ایک راستے کا انتخاب کرنا ہے، ایسے میں اگر انسان فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو وہ دونوں کی طرف لپکنے کی کوشش کرے گا، وہ دونوں ہدف بہ یک وقت حاصل کرنا چاہے گا۔ یہ کسی طور ممکن نہیں، وہ کبھی ایک راستے پر چلے گا، پھر خیال آئے گا تو دوسرے راستے کی طرف رخ کرے گا، نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ کسی طرف بھی سفر نہیں کر سکے گا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس طرح کام یابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ کام یاب لوگوں کا مزاج یہ ہے کہ ایسی صورت حال میں وہ دو میں سے ایک کا انتخاب کرتے ہیں، اور کوشش کرتے ہیں کہ ایسے راستے کا انتخاب کریں، جو زیادہ سہل اور آسان ہو، جلد حاصل ہونے والا ہدف ہو۔ عام طور پر انسان ایسے موقع پر دو طرح کی حکمت عملی اپناتے ہیں، قلیل المدت اور طویل المیعاد، یعنی وہ اپنی ترجیحات متعین کرتا ہے، پہلے کس کو لینا ہے، دوسرے مرحلے میں کس کو ہدف بنانا ہے۔ پہلے مرحلے میں جلد حاصل ہونے والا ہدف رکھتا ہے اور دوسرے ہدف کو موخر کر دیتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صلح حدیبیہ کا حوالہ بار بار آتا ہے، یہاں بھی اس سے مدد ملتی ہے، صلح حدیبیہ صرف ایک صلح نہیں تھی، وہ کثیر الاہداف فیصلہ تھا، اس کے ہدف بہت ہیں، اس کی جہتیں کئی ایک ہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حدیبیہ کے موقع پر دو دشمن تھے، ایک قریش مکہ، دوسرے یہود حجاز، جو مختلف اوقات میں مدینہ منورہ سے نکل کر خیبر میں جا کر آباد ہوئے تھے اور وہاں سے وہ مسلمانوں کے لیے مسلسل چیلنج بنے ہوئے تھے۔ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو جہتی حکمت عمل اپنائی، قلیل المدت تو یہ کہ فوری طور پر قریش مکہ سے صلح کر کے ایک طرف سے اپنی سرحد محفوظ کر لی اور قریش سے ۱۰ سالہ امن کا دورانیہ متعین کر لیا، گو وہ معاہدہ اس مدت تک نہیں چل سکا۔ جس کے نتیجے میں یک سوئی سے خیبر کے مسئلے سے نمٹنے کے لیے آپ ﷺ آزاد ہو گئے، جب صلح حدیبیہ سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ خیبر کے لیے روانہ ہو گئے، وہاں سے فراغت کے بعد مزید واقعات پیش آئے اور قدرتی طور پر حالات ایسے پیدا ہوتے چلے گئے کہ محض چند برسوں میں دونوں اہداف حاصل ہو گئے۔ تصور کیجیے کہ اگر ایسا نہ ہوتا اور دونوں دشمن بہ ایک وقت مسلمانوں پر حملہ آور رہتے تو کیا مسلمان کسی ایک سے بھی یک سوئی کے ساتھ نمٹ سکتے تھے؟ اگر اس وقت مسلمان کسی ایک کا رخ کرتے تو دوسرا مخالف صورت حال دیکھ کر اس میں کود پڑتا اور مسلمانوں کے مقابل دو گروہ ہو جاتے۔

یہ حکمت عملی ہے، اس کا ہم میں آج فقدان ہے۔ یہ حکمت عملی محض لڑائی کے میدان میں ہی کارآمد نہیں، اس کی دنیا بڑی وسیع ہے۔ ہم عملی زندگی میں ہمیشہ کچھ وقفے کے بعد ایک دوراہے پر کھڑے ہوتے ہیں، ہمیں ایک راستے کا انتخاب کرنا ہوتا ہے، مگر ہم الجھ جاتے ہیں، ہمارے اندر کا لالچی انسان دو میں سے ایک راستے کا انتخاب نہیں کرنے دیتا۔ ایسے میں انتخاب کی عادت ڈالیے، اور دیکھیے کہ کون سا ہدف فوری ہے، ضروری ہے، آسان ہے، جلد حاصل ہو سکتا ہے؟ اور کون سا ہدف موخر کیا جا سکتا ہے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھر ایک کو حاصل کرنے کے لیے جان لڑا دیجیے، یقیناً کام یاب ہو جائیں گے اور دونوں ہدف جلد آپ کی گرفت میں ہوں گے۔

وسائل سنبھال کر رکھیے

انسان عجیب و غریب مزاج لے کر پیدا ہوا ہے، یہ گھڑی میں تولا اور گھڑی میں ماشہ ہوتا ہے، غربت میں اس کا چلن کچھ اور ہوتا ہے، اور امارت میں اس کا ڈھب الگ۔ یہ تیزی سے رنگ بدلتا ہے۔ انسان کو اگر وسائل میسر نہ ہوں تو انتہائی قلیل وسائل میں بھی یہ بہت کچھ کرنے کی قوت رکھتا ہے، اور اگر وسائل کی فراوانی ہو تو انہیں ضائع کرنے کے بھی ایسے ایسے راستے سوچ لیتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔

وسائل انسان کے استعمال کے لیے ہیں، ضائع کرنے کے لیے نہیں، سہولت موجود ہو تو اچھے سے اچھا کھانا اور اچھے سے اچھا پہننا بھی کوئی برائی نہیں، لیکن کھانے سے زیادہ برباد کر دینا، پہننے سے زیادہ ضائع کر دینا، پیسوں کو ہوا میں اڑا دینا، سخت ناپسندیدہ طریقہ ہے، اور عملی زندگی میں یہ راستہ ناکامی کی طرف جاتا ہے۔ خالص دنیاوی کام یابی کے تصور سے بھی اس عادت کو دیکھیں تو بھی وسائل کا ضائع کرنا بہ جائے خود ناکامی ہے۔ وسائل، اپنی صلاحیتیں، مال و دولت، وقت، قوت و اختیار، منصب اور ذمے داری ہر چیز کو انسان نے اگر احتیاط سے استعمال کرنا سیکھ لیا تو وہ کام یاب ہے، اور اگر وہ ان میں توازن نہ رکھ سکا، اور یہ طے نہ کر سکا کہ ان میں کوئی سی چیز ضرورت ہے اور کہاں ہم ضرورت کی حد تک سے نکل کر اسراف اور فضول خرچی کی حدود میں داخل ہو رہے ہیں تو وہ کام یابی سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ ہمارے ہاں بہت سی بڑی بڑی ناکامیوں کی بنیاد صرف اور صرف وسائل کا ضائع کرنا ہے۔ جہاں دو افراد کام کر سکتے ہیں، وہاں دس افراد لگا دیتے ہیں، جہاں دس افراد سے کام ہو سکتا ہے، وہاں سو افراد جھونک دیتے ہیں، جہاں ایک دفتر کافی ہوتا ہے، وہاں ہم دفاتر کی چین قائم کر دیتے ہیں۔ یہ اسراف ہر چیز میں نظر آتا ہے، ایک میز کرسی کی ضرورت ہو تو پورا فرنیچر سیٹ ہماری امارت پسندی کی تسکین کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ ادارے وژن سے چلتے ہیں، شخصیات اپنی کام یابی کی راہیں اپنے ذہن اور اپنی محنت سے متعیّن کرتی ہیں، نہ وہ اپنے کپڑوں کی تراش خراش سے یہ کام یابیاں سمیٹ سکتے ہیں، نہ اپنے لمبے چوڑے دفاتر یا بھاری بھر کم فرنیچر کے زور پر کام یاب قرار پا سکتے ہیں، جو کام ہم لمبے چوڑے دفاتر میں بیٹھ کر انجام دیتے ہیں، دنیا میں چھوٹے چھوٹے دفاتر میں بیٹھ کر ہو جاتا ہے، اور شاید ہم سے اچھا اور معیار میں ہم سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہتر ہوتا ہے، وہ کام یاب ہیں، ہم بھی انہیں کام یاب مانتے ہیں، اور ہم کام یابی کی تلاش میں مسلسل سرگرداں، مگر کام یابی سے کوسوں دور۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات بڑی وضاحت سے بیان کی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک بار ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آؤ واقفی کے پاس چلتے ہیں، یہ ایک انصاری صحابی تھے، ان کا ایک باغ تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دونوں رفقا کے ساتھ ایک چاندنی رات میں وہاں پہنچے، واقفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر خوشی سے نہال ہوگئے، خوشی سے ان کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے، انہوں نے خوش آمدید کہا اور چھری لے کر اپنی بکریوں میں چکر لگانے لگے کہ مہمانوں کی ضیافت کے لیے کون سے بکری ذبح کی جائے، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عجیب جملہ ارشاد فرمایا، ایک جملہ، صرف دو لفظ، لیکن ان میں ایک پوری حکمت اور کام یاب زندگی کا اہم ترین اصول موجود تھا، آپ نے فرمایا:

ایاک والحلوب (۱۷)

دیکھو دودھ والی بکری ذبح نہ کرنا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ہدایت یہ فرمارہے ہیں کہ اگر جانور ذبح کرنا ہو تو ضرور کیا جائے، یہ ہماری خوارک کے لیے ہی اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائے ہیں، لیکن اگر کوئی جانور دودھ دینے والا ہے، تو اس سے چوں کہ مزید فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، اس لیے اس کی حفاظت کرنی چاہیے، گوشت ہمیں کہیں اور سے بھی مل جائے گا، مگر دودھ ہر جگہ سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں فہم، فراست اور سمجھ عطا فرمائے۔

معاف کیجیے!

انسان کا خمیر خطا سے اٹھا ہے۔ انسان غلطی کرتا ہے اور درست بات یہ ہے کہ انسان کا تعارف اور پہچان ہی خطا ہے۔ انسان کو غلطی کرنے پر مطعون نہیں کرنا چاہیے۔ غلطی پر اصرار کرنا انسان کی انسانیت کے منافی ہے۔ غلطی کرنا انسانیت کا تعارف اور پہچان ہے۔ انسان کے مزاج کو دیکھتے ہوئے ہم

۱۷۔ ابن ماجہ: ج ۲، ص ۳۵۸، رقم ۳۱۸۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی زندگی کی اصل حقیقت غلطی کرنا ہے اور غلطی نہ کرنا دراصل استثنا ہے۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ استثنا کبھی قانون نہیں ہوتا۔ قانون اصل ہوتا ہے، استثنا اس کا ایک حصہ ہوتا ہے، جو چند لوگوں کو عطا کیا جاتا ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کو یہ استثنا ملا، اور اس کی بہت بڑی حقیقت و حکمت تھی، کیوں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے پیغام کی ترسیل کی ذمے داری دی گئی تھی، اللہ کے پیغام کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق تک پہنچانے کا کام انہوں نے انجام دینا تھا، اس لیے ان کو معصوم رکھا گیا۔

انسان اگر غلطی کرتا ہے تو انسان میں ہر شخص شامل ہے۔ مالک بھی شامل ہے، ملازم بھی شامل ہے، تو پھر انسان کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی روزمرہ کی غلطیوں کو پکڑ کر بیٹھ جائے۔ انسان کی کامیابی کی راہ میں جو سب سے بڑا پتھر ہے، وہ انسان کا کسی بات کو دل میں رکھ لینا اور روک کر بیٹھ جانا ہے، انسانی دل کو اگر چوراہے کی شکل دے دی جائے، خیالات آتے رہیں اور جاتے رہیں، تفکرات آتے رہیں اور جاتے رہیں، لوگ آتے رہیں اور جاتے رہیں، کوئی چیز وہاں بیریئر کی صورت میں رکنے نہ پائے تو کوئی قباحت نہیں ہے۔ اور اگر اس کے چاروں طرف بیریئر لگ جائیں اور ہلکی سے آنے والی ہوا اور ہوا کے ساتھ اڑ کر آنے والی گرد بھی رکنے لگے تو پھر انسان کا خود دل پہلے متاثر ہوگا، دوسرے اس کے بعد متاثر ہوں گے۔ اس لیے انسان کو جو تعلیم دی جانی چاہیے، اس کا ایک ہی عنوان ہے: معاف کیجیے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا: میں اپنے غلام کو کتنی بار معاف کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

دن میں ۷۰ بار معاف کرو۔ (۱۸)

اس قدر کثرت سے معافی کے حکم کا سبب کیا تھا! صرف اور صرف ایک؛ وہ یہ کہ غلطیاں ہوتی رہیں گی، ان غلطیوں کو پکڑ کر بیٹھ جانا زندگی کے سفر کو روک دینے کے مترادف ہوگا۔ ان غلطیوں کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جانا، کامیابی کی ضمانت ہوگی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ قرآن حکیم میں بڑی تفصیل سے آیا ہے۔ اور یہ واحد قصہ ہے جو پوری سورت میں از اول تا آخر ایک انداز میں بیان ہوا ہے۔ اس واقع میں جب برادران یوسف سارے مراحل سے گزر کر دوبارہ، حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچتے ہیں، جب کہ پس ماندہ اور پژمردہ

۱۸۔ بخاری: ج ۳، ص ۴۶۵، رقم ۵۴۶۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں، مالی طور پر انتہائی شکستہ حال اور مدد کے خواہاں ہیں۔ انتہائی عاجزانہ انداز میں وہ اپنی جھولی پھیلاتے ہیں تو حضرت یوسف علیہ السلام سے یہ بات سنتے ہیں کہ تم نے جو کچھ یوسف کے ساتھ کیا تھا، وہ تمہیں یاد ہے؟ اب ان کو احساس ہوا کہ یہ شخص تو ہمارا بھائی ہے، حضرت یوسف تعارف کراتے ہیں کہ میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ اس وقت برادران یوسف کو احساس ہوتا ہے کہ ہم خطاؤں کا کتنا بڑا سفر طے کر کے یہاں پہنچے ہیں۔ فوراً سپر ڈال دیتے ہیں کہ ہم معذرت چاہتے ہیں۔ اس وقت دربار یوسف سے جو جملہ آتا ہے، وہ اہم ترین بات ہے:

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (۱۹)

آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں ہے۔

اب یہاں ہم ذرا سا رک کر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ساری مشکلات جھیلتے ہوئے مکے تک پہنچتے ہیں، فتح مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مجرم قریش مکہ کے تمام لوگ سرنگوں بیٹھے ہیں۔ آپ اس وقت پوچھتے ہیں کہ تمہیں اندازہ ہے کہ میں کیا کرنے والا ہوں؟ وہ نبوت کو بھی پہچانتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کے شناسا بھی تھے، انہوں نے کہا: آپ شریف آدمی ہیں، شریف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، آپ سے ہمیں شرافت کی ہی امید ہے۔ اس وقت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بھائی یوسف علیہ السلام کا یہ جملہ دہرایا تھا:

لا تثریب علیکم الیوم، اذھبوا فأنتم الطلقاء (۲۰)

جاؤ تم آزاد ہو۔

یہ ہے نبوت کا مزاج اور یہ ہمیں اسوۂ حسنہ کی تبلیغ و تلقین ہے کہ وہ اپنے دربار میں اتنے بڑے بڑے مجرموں کو معاف کر سکتے ہیں تو ہم چھوٹی موٹی غلطیاں کیوں معاف نہیں کر سکتے۔

۱۹۔ یوسف: ۹۲

۲۰۔ ابن ہشام: ج ۴، ص ۹۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مشکلات

قرآن حکیم میں دنیاوی زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت اور ایک بڑا راز انتہائی مختصر سی آیت میں اور انتہائی جامع اسلوب میں بیان فرمایا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍO (۲۱)

انسان کو کہا گیا ہے کہ وہ مشقتوں میں ہے، یہ وہ حقیقت ہے جو ہم سے روزانہ نظر انداز ہوتی ہے۔ ملازمت کا ذکر ہوتا ہے تو کہتے ہیں بڑے مسائل ہیں۔ ہم گھریلو زندگی کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ صاحب! گھر کے معاملات چلانا بڑا مشکل ہے۔ خاندان کے امور کی بات ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ خاندان کو ساتھ لے کر چلنا تو ایک آزمائش ہے۔ انسان کو شہر میں رہائش ملے تو کہتا ہے شہر کے مسائل ہیں، شور و شغب ہے، ٹریفک ہے، اژدھام ہے، پارکنگ کے مسائل ہیں، شہر میں وقت گزارنا بڑا مشکل ہے۔ اگر مضافات میں رہائش مل جائے تو کہتا ہے شہری زندگی سے دور رہنا بڑا مشکل ہے۔ اتنی دور آنا اور پھر الگ تھلگ رہنا بہت مشکل ہے۔ اگر انسان کسی بڑے باوقار اور باوسائل شہر میں بستا ہے تو کہتا ہے کہ یہاں کے مسائل بڑے تکلیف دہ ہیں، اگر اللہ نے اس کی زندگی کسی دیہات میں رکھی ہے تو شہر کی چکاچوند دیکھ کر کڑھتا رہتا ہے کہ کاش! میں یہاں کا حصہ ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ مشقتیں انسان کو زندگی میں ہمہ وقت سرگرم رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی منصوبہ بندی کا ایک حصہ ہیں۔ یہ مشقتیں اوپر سے نہیں لائی گئیں، بل کہ اس کارخانہ حیات انسانی کے مزاج و بنیاد میں اللہ تعالیٰ نے رکھ دی ہیں، اور مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ انسان سستی اور کاہلی کا شکار ہوئے بغیر سرگرم اور ہمہ وقت جستجو اور محنت و مشقت میں مصروف رہے۔

عملی طور پر اگر اس کو سمندر یا پانی کے ایک بڑے ذخیرے سے تشبیہ دیں تو ہمارے لیے یہ بات سمجھنا اور سمجھانا مزید آسان ہو سکتا ہے۔ دیکھیے! اگر پانی کو روک دیا جائے تو وہ اپنی تاثیر کھو بیٹھتا ہے، اپنا رنگ و بو کھو دیتا ہے، اس کا حسن برباد ہو جاتا ہے، وہ رکا ہوا پانی رفتہ رفتہ جوہڑ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اب اس فطری کیفیت کو اللہ تعالیٰ نے کیسے تبدیل فرمایا؟ سمندر کا پانی بہت بڑا ذخیرہ ہے، جس کے بہت سے مقاصد ہیں، ہم اپنی معلومات کے درجے میں کہہ سکتے ہیں کہ اس کے نیچے نامعلوم تعداد میں مخلوق

۲۱۔ بلد:۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بستی بھی ہے اور زندگی بھی گزار رہی ہے۔ اس اتنی بڑی کائنات میں اللہ تعالیٰ نے یہ عمل رکھا ہے کہ پانی مسلسل تلاطم خیز رہتا ہے، اس میں لہریں اٹھتی رہتی ہیں۔ نتیجتاً پانی مسلسل اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے، بالفرض اگر یہ تلاطم خیز موجوں کا سلسلہ ختم کر دیا جائے، اور اس میں ٹھہراؤ آجائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ پہلے پانی بو دینے لگے گا، کچھ دنوں بعد وہ سڑنے لگے گا، اس کے بعد اس کے اندر کی مخلوق برباد ہونے لگے گی، اور ایک وقت آئے گا کہ یہاں پانی کی بہ جائے کیچڑ کی ایک بڑی دنیا ہوگی، جس کو سر کرنا یا اس سے اپنا دامن بچانا کسی کے لیے ممکن نہیں رہے گا۔

یہی زندگی کی بات ہے۔ اگر ہمیں انسانی زندگی کو جوہڑ بننے سے بچانا ہے تو سب سے آسان صورت یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے سے موجود اتار چڑھاؤ اور تلاطم کو انجوائے کرتے ہوئے اور اس سے استفادہ کرتے ہوئے ہم اپنی زندگی گزاریں۔ اپنے آپ کو، اپنے افکار کو اور اپنے جسم کو منجمد ہونے سے بچائیں اور آخری لمحے تک جدوجہد کرتے ہوئے اپنے رب کے حضور حاضر ہو جائیں۔

شکایات

انسانی مزاج اور انسانی زندگی کا ایک بڑا مرحلہ شکایات کے گرد گھومتا ہے۔ انسان مسلسل شکایت اور شکایتی لہجے سے اپنی زندگی کے کچھ حصے کو آلودہ کرتا ہے۔ اس کیفیت میں سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ انسان میں منفی مزاج پیدا ہو جاتا ہے اور یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ چوں کہ میں نے شکایت کرنے کا فریضہ سرانجام دے دیا، اب میرے ذمے کوئی فریضہ باقی نہیں رہا۔ اس صورت میں اصلاح احوال کی کوئی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی۔

انسان کا ذہن ایک عجیب و غریب مشین ہے، انسان جس چیز کی طرف ذہن کو مصروف کرتا ہے، وہیں وہ مہارت حاصل کرتا چلا جاتا ہے، آپ نے اور ہم نے اپنی عملی زندگی میں دیکھا ہے کہ جو تنقید کو اپنا شعبہ بناتے ہیں اور اسی پر محنت کرتے ہیں، ان کو یہ کمال فن حاصل ہو جاتا ہے کہ بہت ہی معقول قسم کے ماحول سے بھی تنقیدی آثار تلاش کر لیتے ہیں، جو چیزیں کوئی دوسرا شخص بڑی آسانی سے نظر انداز کر دیتا ہے، ہمارے یہ ماہرین بڑی آسانی سے نظر واحد میں اس کو غلط قرار دے دیتے ہیں۔ دراصل یہ فن سے زیادہ اس خاص پہلو سے محنت کے اثرات ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شکایت کا معاملہ بھی یہی ہے، انسان اگر مطمئن زندگی گزار رہا ہے اور اس کا سوچنے کا انداز مثبت ہے، منفیت کا حصہ اس کی زندگی میں بہت کم ہے، جس سے عام طور پر بچنا مشکل ہوتا ہے، تو اس کے لیے ہر پہلو سے کام کرنا آسان ہوتا ہے اور وہ شکایت کی بہ جائے عملی زندگی میں اپنا حصہ شامل کرنے کو کام یابی سمجھتا ہے۔ اگر انسان یہ تصور کرے کہ اس کا بنیادی فریضہ دوسروں کی غلطیاں پکڑنا ہے، تو وہ اس کے لیے بہت آسان ہو جاتا ہے کہ وہ غلطیاں پکڑتے ہوئے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ گزار دے، لیکن اس کا بڑا نقصان یہ ہے کہ انسان کا معاشرے میں تاثر ہی منفی بن جاتا ہے اور اس کی جائز شکایت کو بھی سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا۔ اس کے بعد ایسے شخص کے لیے انسانی معاشرے میں کوئی مثبت کردار ادا کرنا ممکن نہیں رہتا۔ بڑی بڑی صلاحیتیں اس گرداب کا شکار ہو کر برباد ہو گئیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں کس قدر مشقتیں ہیں؟ کس قدر سازشیں ہیں؟ لیکن پوری حیات طیبہ کے مطالعے کے بعد شاید کوئی شخص شکایت کا موقع نہ نکال سکے۔ دو، تین جملے پوری زندگی میں آپ نے ادا فرمائے ہیں۔ ایک دو بار شکایتی انداز ہے، مگر وہ بھی اپنے رب کے سامنے۔ اور وہ شکایت نہیں ہوتی، رب اندر اور باہر سب کا حال جانتا ہے، اس کے سامنے شکایت نہیں، بل کہ اس کی مدد طلب کرنے کا ایک اسلوب ہے۔ اس کو اسی انداز میں دیکھنا چاہیے۔ اس کے برعکس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی موقع پر انسانی زندگی میں جو شکایتی انداز اختیار کیا، وہ بھی شکایت نہیں بل کہ کسی نہ کسی پہلو سے عذر پیش کرنا تھا۔ جیسے فتح مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا جاتا ہے کہ اب آپ کا قیام کہاں ہوگا؟ آپ نے فرمایا: میں مدینے میں رہوں گا، پھر فرمایا کہ میرے لیے مکان ہی کہاں چھوڑا گیا ہے؟ ہماری رہائش کا خاندانی سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے، اس لیے میرے لیے رکنا ممکن نہیں۔ اب یہ ان کو مطمئن کرنے کا انداز تھا، جس کا ایک ہلکا سا اسلوب شکایتی بھی بنتا ہے، ورنہ عملاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بہت پہلے انصار مدینہ سے یہ وعدہ کر چکے تھے کہ اب ان کا مرنا جینا، ان ہی کے ساتھ ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت جو اتنی مشقتوں بھری سیرت ہے، یہ بتاتی ہے کہ انسان کو عملی زندگی میں صرف اپنا حصہ ادا کرنا اور اس کی طرف اس کی توجہ ہونا چاہیے اور اس کی طرف اس کی تگ و دو ہونی چاہیے۔ اس کی پوری سوچ، عمل، گفتار اور کردار کے تمام پہلو اسی کی طرف متوجہ رہنے چاہییں، بہ جائے اس کے کہ وہ شکوہ شکایت کر کے اپنی زندگی کو بھی مختصر کرے، اپنی راہ بھی کھوٹی کرے اور اپنا وقت بھی برباد کرے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عبرت

عبرت قرآن حکیم کا ایک بہت بڑا عنوان ہے، بل کہ قرآن حکیم نے جتنے واقعات بھی بیان کیے ہیں، ان کو درس عبرت کے طور پر ہی پیش کیا ہے اور اس کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ قرآن کا قاری ان واقعات سے ماضی میں گزرنے والی قوموں اور نمایاں افراد کی زندگیوں اور حالات سے عبرت حاصل کرے۔ لیکن یہ عبرت کیا ہے؟ عبرت اتنا بڑا لفظ ہے اور اس کے پیچھے موجود حقیقت اتنی وسیع ہے کہ اس کو جانے بغیر اور اپنی زندگی کا معمول بنائے بغیر ہم ایک کام یاب زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ عبرت کا مفہوم ہے کہ سامنے موجود اور نظر آنے والی کسی بھی حقیقت کے پس منظر میں جانے کی کوشش کرنا اور یہ دیکھنا کہ اس سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟ وہ سبق تحریر میں اور لفظوں میں موجود نہیں ہوتا، وہ سبق کسی بھی واقعے کی ساخت میں موجود ہونے کے باوجود غالباً اس کے ظاہری حصے میں بھی موجود نہیں ہوتا، لیکن اس کی بُنت کا لازمی حصہ ہوا کرتا ہے۔ اگر انسان اس عبرت کو جاننے کی صلاحیت پیدا کر لے اور یہ سمجھنے لگے کہ کائنات کے نظام میں موجود اور اس کائنات کی ترتیب میں دن بہ دن لمحہ بہ لمحہ واقع ہونے والے واقعات اور پیش آنے والے حادثات میں عبرت اور سبق کیا ہے؟ تو ایک انسان اپنی ماضی کی زندگی کو بہتر کر کے بہتر مستقبل کی تعمیر آسانی سے کر سکتا ہے۔

ہم پہلے بھی یہ بات عرض کر چکے ہیں کہ انسانی زندگی میں غلطی کوئی بڑی حقیقت نہیں رکھتی۔ انسان غلطی کرتا آیا ہے اور قیامت تک انسانی وجود سے غلطیاں ظاہر ہوتی رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی غلطی کوئی بہت بڑی چیز نہیں سمجھی گئی، بل کہ بعض اوقات تو یہ غلطی انسان کے لیے رب کی نعمت اور رحمت بن گئی ہے۔ اصل چیز جو اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل گرفت برائی کی حیثیت رکھتی ہے، وہ ہے انسان کا غلطی سے کچھ نہ سیکھنا، غلطی کو غلطی نہ سمجھنا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی غلطی پر اصرار کرنا۔ ایک ہی چیز کو جانتے بوجھتے بار بار دہراتے رہنا۔ اس کا آخری نقطہ اس غلطی کو درست سمجھنا ہوتا ہے، جس کا ایک ثبوت یہ ہوتا ہے کہ انسان اس کی وجوہات تلاش کرنے لگتا ہے، اور اس کی صفائیاں پیش کرنے لگتا ہے، ایسے بیانات دینے لگتا ہے کہ اس کو دیکھ کر سامنے والا تصور کرے کہ یہ غلطی درحقیقت غلطی ہی نہیں تھی، جب کہ حقیقت میں انسان کی یہی سب سے بڑی غلطی ہوتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک واقعے سے ہمیں سبق حاصل کرنے کی ہدایت فرمائی اور خود بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بیان اور گفت گو میں اور اپنی ہدایت میں عبرت پذیری کی بہت سی مثالیں پیش فرمایا کرتے تھے، کچھ مثالیں تاریخ میں موجود بھی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت آج ہمارے لیے ایک درس ہے، اگر ہم اس درس کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیں تو یہ ہمارے لیے یہ درس ایسا سبق بن سکتا ہے، جس کے نتیجے میں ہم اپنی ماضی کی غلطیوں سے سیکھتے ہوئے اپنے مستقبل کے لیے اچھے راستے تلاش کرسکتے ہیں۔

کائنات میں وقوع پذیر ہونے والا ہر واقعہ اہم ہے۔ اسے سمجھنا ہمارا اصل چیلنج ہے۔ سمجھنا اور یہ دیکھنا کہ ہم کہاں کھڑے ہیں، یہی عبرت ہے۔

عزت دیجیے

ہماری زندگی میں ایسا ممکن نہیں ہے کہ ہمارا کسی سے رابطہ اور تعلق نہ ہو، ہمارا کسی کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا نہ ہو۔ جب یہ سب کچھ ہے تو پھر دو ہی صورتیں ممکن ہیں، یا تو ہم اپنے ملنے والوں سے عزت و احترام سے پیش آئیں، یا ہم ان کو نظر انداز کردیں اور پھر نظر انداز کرنے کی آخری صورت بدتمیزی کی حدود میں بھی داخل ہوجاتی ہے۔ ہمارا عمومی رویہ اس معاملے میں کیا ہے؟ اور ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ یہ ایک بہت ایک سوال ہے، اور بہت اہم نکتہ ہے، جس کو پیش نظر رکھ کر ہم اپنی کام یابی کے اصول و ضابطے طے کرسکتے ہیں۔ ہمارا ملنا جلنا دو طرح کے لوگوں سے ہوتا ہے، ایک وہ جو ہماری ضرورت ہیں، ایک وہ جن کی ہم ضرورت ہیں۔ جو ہمارے ماتحت ہیں یا جن کو کسی وقت ہم سے کوئی کام پڑ سکتا ہے، ان کا ہم سے ملنا نیاز مندانہ و عاجزانہ اور انکساری کے ساتھ ہوگا، اور جن سے ہمارا کام وابستہ ہے اور ان سے ہمیں کوئی ضرورت پیش آسکتی ہے، ان سے ہمارا ملنا بھی عاجزانہ و نیاز مندانہ اور انکسارانہ ہوگا، لیکن اگر ہم اس کو الٹا کردیں، وہ لوگ جن کی ہم سے ضرورت وابستہ ہے، ان سے ہم انکساری سے ملیں تو یہ انکساری و عاجزی ہے، یہ انسانیت کا احترام ہے، اس لیے کہ اس صورت میں ہماری عاجزی و انکساری سے ہماری کوئی غرض وابستہ نہیں ہے۔ عام طور پر ہمارا رویہ یہ بن چکا ہے کہ اس طرح کے افراد سے ملنے میں عاجزی کو غلط مفہوم دیا جاتا ہے، اور اب تو معاشرے میں اس بات کا اس قدر چلن ہوچکا ہے کہ بالفرض اگر کوئی شخص عادتاً بھی عاجزی و انکساری کا مظاہرہ کرتا ہے تو وہ طبقہ بھی جس کی ہم سے کوئی ضرورت وابستہ ہو، اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو صحیح معنی میں نہیں لیتا۔ لوگ بھی اس بات کے عادی ہو چکے ہیں کہ جن کو بڑا سمجھا جاتا ہے، وہ بڑے بن کر رہیں، اگر بڑا پن ظاہر نہ کیا جائے تو سمجھا جاتا ہے کہ شاید یہ بڑا ہی نہیں ہے، یا یہ بڑا بننے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ ایسا ہرگز نہیں، انسان کی بڑائی کا اظہار اور بڑائی کی آزمائش تو اسی صورت میں ہوتی ہے جب وہ بڑا ہوتے ہوئے چھوٹوں کے ساتھ عاجزی وانکساری سے پیش آتا ہے۔

یہاں ایک معاملہ اور بھی ہے، یہ دراصل دوسروں کو عزت دینے کا عنوان ہے۔ دوسروں کو عزت دینا ہماری بنیادی ضرورت ہے، یہ انوسٹمنٹ کے درجے کی چیز ہے، جو شخص دوسرے کو عزت نہیں دے گا اس کو خود عزت ملنا ممکن نہیں ہے، جب کہ عزت کی طلب ہر ایک کو ہے۔

انسان جب خوب کمالیتا ہے اور یہ بات محسوس کرتا ہے کہ وہ کمانے کی تگ ودو سے باہر نکل چکا ہے، تب وہ خرچ کرنے پر آتا ہے، محض اس مقصد سے کہ اس کو کچھ عزت مل جائے یا جو عزت میسر ہے اس میں اضافہ ہی ہو جائے۔ اس سطح پر اور اس مقام پر پہنچنے والے افراد کے لیے اگر عزت ضرورت ہے، تو دوسروں کو اس سے کیسے انکار ہو سکتا ہے؟ اس لیے بنیادی طور پر یہ معاملہ احترام دینے کا ہے، اگر ہم احترام لینا چاہتے ہیں تو ہمیں احترام دینا پڑے گا، اگر ہم عزت کروانا چاہتے ہیں تو ہمیں دوسروں کی عزت کرنی ہوگی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑوں کے احترام اور چھوٹوں پر شفقت کی سخت تاکید بھی فرمائی ہے،[۲۲] اور آپ کا اپنا رویہ بھی یہی تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ جو دوسری تلقین آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی وہ ہے۔

انزلوا الناس منازلھم[۲۳]

لوگوں سے ان کے مقام ومرتبے کے مطابق سلوک کرو۔

اور ان کا مقام پہچان کر ان کے ساتھ احترام کا معاملہ کرو۔ تیسری چیز جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے فرمائی، وہ یہ تھی کہ ہر شخص کا احترام اہم ہے، یہاں تک کہ اگر کسی غیر مسلم کا جنازہ بھی جا رہا ہے، تو اس کے احترام میں آپ نے کھڑے ہو کر[۲۴] یہ عملی تلقین فرمائی کہ اگر کسی میت کا احترام اس

۲۲۔ ابوداؤد: ج ۴، ص ۳۱۱، رقم ۴۹۴۳

۲۳۔ ابوداؤد: ج ۴، ص ۲۸۱، ۲۸۲، رقم ۴۸۴۲

۲۴۔ مسلم: ج ۲، ص ۶۴، رقم ۲۶۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درجے میں ہے تو جیتے جاگتے انسان کا احترام ہمیں کس درجے میں کرنا ہوگا؟ بات وہی ہے کہ یہ اس لیے ضروری ہے، تاکہ ہم اپنے معاشرے میں اپنا مقام متعین کر سکیں اور عزت کر کے عزت کرواسکیں۔

ہم اگر اپنی عزت کرانا چاہتے ہیں تو ہم پر لازم ہے کہ دسروں کو احترام دینا سیکھیں۔

اپنے ہاتھ سے

کام یابی کا ایک گر انسان کے لیے اپنے ہاتھ کا استعمال ہے، یعنی اپنا کام خود سمیٹنا اور انسان کا اپنی ضرورتوں کے لیے کبھی دوسرے کا محتاج نہ بننا۔ یقیناً کچھ ذمے داریاں ایسی ہوتی ہیں کہ منصبی تقاضوں کے تحت ہمیں مددگار میسر آجاتے ہیں، وہ دراصل ہمارے آج کے مزاج کے مطابق تو ہمیں اعزاز تصور ہوتے ہیں، ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں عزت دی گئی ہے، ہمارے منصب کا اور ہمارے منصب کے وقار کا خیال رکھا گیا ہے، درحقیقت ایسا نہیں ہے جوں جوں انسان منصبی اعتبار سے زیادہ ذمے داریوں کا حامل ہوتا چلا جاتا ہے، اسی اعتبار سے، اسی ترتیب سے، اسی اضافے کے ساتھ انسان کے لیے وقت کی قدروقیمت بڑھتی چلی جاتی ہے، ایسے میں انسانی منصب کو زیادہ کارآمد بنانے کے لیے ان مناصب پر فائز لوگوں کے لیے کچھ ایسے مددگار مہیا کیے جاتے ہیں جو ان کے وقت کو قیمتی بنا سکیں، اور ان کی وہ چھوٹی چھوٹی ضرورتیں پورا کر سکیں جنھیں اگر وہ شخص خود پوری کرنے لگے تو اس کا اصل کام متاثر ہوگا۔ یادہ بہتر کارکردگی نہیں دکھا سکے گا۔

کام کی بہت سی نوعیتیں ہوتی ہیں، اگر ایک انسان بڑے منصب کا حامل ہے اور اس کا بنیادی کام سوچ اور فکر کا ہے، پالیسی کی تیاری اور منصوبہ بندی کا ہے، اب ایسے شخص کو کہا جائے کہ اپنی چائے بھی خود بنائے، اپنی میز بھی خود صاف کرے اور وہ اپنا بیگ تھام کر خود ہی گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا آفس سے آئے تو یہ سب کام یقیناً اس کو کرنے چاہییں، اس میں اس کا منصب حائل نہیں ہوتا، لیکن اس کے نتیجے میں وہ ان چھوٹے کاموں میں جو وقت صرف کرے گا اگر وہ اپنی سطح کے کسی کام پر صرف کرے تو زیادہ نتائج دے سکتا ہے، بہ نسبت ان لوگوں کے جو ان کی مدد کے لیے متعین کیے گئے ہیں۔ ان کا علم، ان کی تعلیم، ان کا منصب اور ان کی ذمے داریاں اور ان کی صلاحیتیں جس سطح کی ہیں وہ اپنی خدمات وہاں اپنے انداز میں بہت اچھی طرح پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ ایک استثنا ہے، خاص حالات میں، اور ان حالات میں بھی انسان کے لیے یہ استثنا نہیں کہ وہ کام کرنا ہی سرے سے ناجانتا ہو، ہر انسان کو اپنی بنیادی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضرورتوں سے واقفیت ہونی چاہیے۔ البتہ اس کو اگر موقع ملے تو وہ اپنا کام کرے، موقع میسر نہ ہو یا یوں کہہ لیجیے اس کو یہ سہولت میسر ہو کہ وہ کام دوسرے ادا کر سکیں تو وہ اپنے مقام کے اعتبار سے اپنی اصل ذمے داری میں مصروف ہو جائے۔

لیکن ہمارا کلچر اس سے مختلف ہے، ہمارے ہاں ذہنی طور پر یہ تصور کر لیا گیا ہے کہ کچھ کام چھوٹے ہیں، ہمارے معیار کے نہیں، لیکن ہم اپنے کپڑے خود استری کریں، ہم اپنے جوتے خود پالش کریں، اپنی میز کرسی خود صاف رکھیں، یا اس نوعیت کے اور دوسرے کام ہمارے لیے باعث عار ہیں، ایسا نہیں ہے جناب رسول اکرم ﷺ کی سیرت ہمیں یہ بتاتی ہے کہ منصب کتنا ہی بلند ہو جائے، انسان مقام و مرتبے کے اعتبار سے کتنی ہی رفعتوں اور بلندیوں کا حامل ہو جائے، یہ کام چھوٹے نہیں ہوتے، نا ان کاموں کے کرنے سے کوئی شخص چھوٹا ہو جاتا ہے۔ دنیاوی اعتبار سے بھی، اخروی اعتبار سے بھی۔ اللہ تعالیٰ کی نظر میں مقام نبوت ظاہر ہے کہ کیا کہنا اور ہم جیسا کوئی اس مقام کے بارے میں کوئی لفظ کیسے ادا کر سکتا ہے، لیکن اگر دنیاوی اعتبار سے دیکھا جائے تو تمام وہ مناصب اور وہ مقام اور وہ اعزازات جو اس وقت کے کسی بڑے سے بڑی دنیاوی شخصیت کو حاصل ہوتے تھے وہ اعلیٰ اور ارفع ترین حیثیت سے جناب رسول اکرم ﷺ کو میسر تھے، ان تمام اعزازات کے ساتھ ان تمام مقامات کی بلندیوں کے ساتھ، جناب رسول اکرم ﷺ کے بارے میں یہ روایت آتی ہے کہ آپ ﷺ گھر کے کام خود کر لیتے تھے جانوروں سے دودھ دھونا، پیوند لگانا ہوتا تھا تو آپ کسی معاملے میں دوسروں سے پیچھے نہیں رہتے اور آپ اپنے کام اپنے ہاتھ سے انجام دیا کرتے تھے۔[۲۵] یہی انسان کی خوبی ہے یہی انسان کی کام یابی ہے، اور یہ انسان کی کام یاب زندگی کے اہم ترین رازوں میں سے ایک راز ہے۔

اختلاف

اختلاف زندگی کا حسن ہے، اختلاف کہتے ہیں کہ کسی ایک چیز کا دوسری چیز سے مختلف ہونا، ممتاز و الگ ہونا۔ یہ رائے بھی ہو سکتی ہے، انسان بھی ہو سکتا ہے، انسان کا پہناوا بھی ہو سکتا ہے، کھانے پینے کی عادات و روایات بھی ہو سکتی ہیں۔ یہ تمام چیزیں ہمیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ وہ تمام چیزیں جو انسان کو دوسروں سے الگ و ممتاز کرنے کا سبب بنتی ہیں، اختلاف کے دائرے میں آجاتی ہیں، لیکن عام

۲۵۔ شمائل ترمذی: رقم ۳۴۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طور پر اختلاف کا لفظ فکر و نظر کے اختلاف کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارے ذہن میں اختلاف کا لفظ ہمیشہ منفی معنی میں آتا ہے۔ یہ لفظ استعمال ہوتے ہی ہمارے ذہنوں میں جو تصویر آتی ہے وہ منفی ہوتی ہے، مثبت نہیں ہوتی۔

اختلاف کو اگر قرآن کی اصطلاح میں دیکھیں تو اس نے اختلاف الوان کہا ہے، یعنی رنگوں کا اختلاف اور اس کو اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی شمار کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی بے شمار نشانیوں میں سے ایک نشانی انسان ہے۔ انسانی کائنات اور اس میں موجود طرح طرح کی مخلوقات کی رنگا رنگی اور ہماہمی ہے اور یہی اختلاف ہے۔ [۲۶] یہ انسانی زندگی کی پہچان ہے، لیکن ہمیں صرف اس کے ایک پہلو پر بات کرنی ہے اور وہ ہے فکر و نظر کا اختلاف!

انسان چاہے تو اختلاف سے سیکھ سکتا ہے، چاہنے کی قید اس لیے لگائی کہ عموماً انسان اس سے سیکھنا نہیں چاہتا، بل کہ اس کو فساد اور لڑائی کی بنیاد بناتا ہے۔ ہوتا کچھ یوں ہے کہ جب ہماری رائے کے برعکس کوئی رائے ہمارے سامنے آتی ہے تو ہم اس کو مخالفت تصور کرتے ہیں، حال آں کہ یہ مخالفت نہیں ہوتی، یہ تو تنوع ہوتا ہے۔ یہ ایک سے زائد آپشن کا استعمال ہوتا ہے۔ انسان اگر کہیں سفر کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے سامنے تین آپشن موجود ہوتے ہیں۔ بہ راستہ سڑک، بہ راستہ ٹرین، بہ راستہ ہوائی جہاز، یہ اختلاف ہے۔ مجھے اگر ٹرین کا سفر پسند ہے اور میرے سامنے کوئی شخص جہاز کی بات کرتا ہے، یا اپنی گاڑی یا کرائے کی کوچ سے سفر کرنے کی بات کرتا ہے تو وہ اختلاف نہیں کر رہا بل کہ مجھے مزید دو آپشن سے آگاہ کر رہا ہے کہ آپ کے ذہن میں جانے کی صرف ایک صورت تھی، آپ اس کے علاوہ صورتوں سے ناواقف تھے، لیکن اس شخص کے مطلع کرنے اور اختلاف کرنے سے سے آپ کے سامنے دو نئے راستے آگئے۔ اگر اس نوعیت کو سامنے رکھا جائے اور اختلاف کو اس انداز میں لیا جائے تو یہ انسان کے لیے سراسر رحمت بن جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اختلاف کرنے والے لوگ، اختلاف نہ کرنے والوں اور آپ سے سو فیصد متفق ہونے والوں سے زیادہ قیمتی بن کر سامنے آتے ہیں۔ اس لیے کہ جو سو فیصد آپ سے متفق ہے اور آپ کی ہاں میں ہاں ملانے والا ہے، وہ صرف آپ کا مددگار و معاون ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ معاون آپ کے بنائے ہوئے کام کو آگے بڑھا سکتا ہے، آپ کی دی ہوئی حدود پر کام کر سکتا

۲۶۔ دیکھیے: الفاطر: ۲۷۔ النحل: ۱۳۔ الزمر: ۲۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے، وہ خود حدود متعین نہیں کر سکتا۔ حدود متعین کرنے کے لیے آپ کو جس فکر اور وژن کی ضرورت ہے، وہ اتفاق کرنے والا آپ کو نہیں دے گا، یہ نعمت آپ سے اختلاف کرنے والا ہی آپ کو دے سکتا ہے۔ انسان اگر زندگی میں کام یابی کا طلب گار ہے تو وہ بغیر وژن کے کام یاب نہیں ہو سکتا، اپنے لائحہ عمل اور منصوبے کو بار بار زیرِ غور لائے کے بغیر کام یاب نہیں ہو سکتا۔ یہ تمام چیزیں سوچ سے پیدا ہوتی ہیں، اور سوچ دینے والا ہمیشہ آپ سے اختلاف رائے رکھے گا، یعنی آپ کے سامنے آپ کو موجود آپشن کے علاوہ مزید آپشن رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہوگا۔ اگر وہ یہ صلاحیت رکھتا ہے تو وہی شخص اختلاف کرنے والا ہے، لیکن وہی شخص آپ کو راستہ بتانے والا بھی ہے۔ اگر وہ اس درجے پر فائز نہیں ہے تو وہ محض آپ کا تابع فرماں اور آپ کا مقلد ہے، جو آپ کی فکر اور آپ کے وژن کو آگے لے جانے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

مصلحت اور کم زوری

کام یابی کے لیے انسان کو قدم قدم پر مصلحت کی ضرورت پیش آتی ہے، لیکن مصلحت کو سمجھنا، پھر اس کے مطابق فیصلہ کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ جو اس میدان میں پیش آتا ہے، وہ یہ ہے کہ جو مصلحت ہمارے پیشِ نظر موجود ہے، کیا وہ واقعی مصلحت ہے یا ہمارا اندرونی خوف ہے، جو مصلحت کی شکل اور روپ دھار کر ہمارے سامنے آکھڑا ہوا ہے۔ کون سی ایسی کسوٹی ہے جس سے کام لے کر ہم یہ فیصلہ کر سکیں کہ کیا واقعی یہ مصلحت تھی یا ہماری انسانی کم زوری و احساس کم تری تھا، جس نے حالات کے مقابلے سے راہ فرار اختیار کرنے کے لیے یہ صورت اختیار کر لی۔

اس کی ایک کسوٹی ہمیں سیرت طیبہ کے مطالعے سے حاصل ہوتی ہے، اور وہ بڑی دل چسپ کسوٹی ہے اور بڑا باریک نکتہ ہے، اگر انسان اسے سمجھ لے تو اس کے ذہن سے یہ الجھن دور ہو سکتی ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر بہ ظاہر میں مسلمانوں نے دب کر صلح کی، یہ تاثر آج ہمارا نہیں ہے، عین موقع پر موجود جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی تاثر تھا کہ یہ صلح ہمارے شایانِ شان نہیں۔ اس صلح کو ہم مصلحت کہتے ہیں، اور اسی انداز سے بیان کرتے ہیں۔ اب یہاں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ درمیان میں موجود تھی، اس لیے ایسا کوئی امکان نہیں کہ خدانہ خواستہ کسی کم زوری کی وجہ سے یہ صلح کی گئی، لیکن بالفرض اس طرح کا واقعہ پیش آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم درمیان میں موجود نہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوں تو کیسے جانچا جائے گا کہ یہ عین مصلحت ہے، اس میں کوئی کم زوری اور احساس کم تری کی بات نہیں ہے، یہ انسان کے اندر کی کوئی خواہش نہیں ہے جو اس کو مقابلے سے فرار کی طرف راغب کر رہی ہے۔

دیکھیے! اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ کے دستخط سے پہلے ایک خبر کی بنیاد پر، جو بعد میں افواہ ثابت ہوتی ہے، لیکن اس وقت تک ایک خبر ہے، ایک بیعت لیتے ہیں، وہ بیعت صرف تاریخ میں نہیں، دنیا کی سب سے سچی کتاب قرآن مجید میں بیعت رضوان کے نام سے بیان ہوئی ہے:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ[۲۷]

یقیناً اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے۔

اس موقع پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حوالے سے اڑائی جانے والی شہادت کی خبر کے بعد ان کی شہادت کا بدلہ لینے کے لیے بیعت کی جاتی ہے، اس وقت صحابہ کرام کا رویہ اور جذبہ دیکھیے! بیعت کے لیے اور میدان میں اتر کر بدلے کے لیے، اور اپنی قربانی پیش کرنے کے لیے انتہائی سرشاری اور نہایت جاں نثاری کے ساتھ وہ صدائے نبوت پر لبیک کہتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر مصلحت کے ساتھ سرشاری و جاں نثاری بھی موجود ہو، انسان میدان عمل سے چند لمحوں کے لیے پسپائی کی شکل بنا رہا ہو، لیکن اس کے رویے یہ ظاہر کر رہے ہوں کہ وہ اس وقت آگے بڑھنے کے لیے پیچھے ہٹ رہا ہے، راہ فرار اختیار کرنے کے لیے پیچھے نہیں ہٹ رہا، تو اس وقت بے دھڑک کہا جا سکتا ہے کہ یہ معاملہ عین مصلحت کا ہے، مداہنت و فرار کا نہیں ہے۔ یہ مرحلہ موقع کو سمجھنے کا ہے، ذمے داری سے بھاگنے کا نہیں۔ اس لیے اس فرق کو سمجھ کر فیصلہ کیجیے، اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔

نفاست

کام تو انسان جیسے تیسے کر ہی لیتا ہے، جب اس پر پڑتی ہے تو پیٹ بھی بھر لیتا ہے، گھر بھی چلا لیتا ہے، کھا پی بھی لیتا ہے اور پہن اوڑھ بھی لیتا ہے، لیکن کسی کسی کو ہی یہ توفیق ملتی ہے کہ وہ یہ سب کام نفاست اور سلیقے سے انجام دیتا ہے۔ انسان کو سفر در پیش ہو تو بیگ میں سامان سفر ضرور رکھنا پڑتا ہے، اب کسی کا بیگ تو اس قدر نفاست سے جما ہوا نظر آتا ہے کہ ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوتی ہے، اور ضرورت

۲۷۔ فتح: ۱۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پڑنے پر فوراً ہاتھ میں آجاتی ہے، اور کسی کا بیگ بے ترتیب سامان سے یوں بھرا ہوتا ہے، جیسے کچرا کسی تھیلے میں ٹھونس دیا جاتا ہے۔ کام تو دونوں صورتوں میں ہو جاتا ہے، مگر ایک صورت میں انسان سلیقہ مند نظر آتا ہے، دوسری صورت میں اس کے بارے میں اچھا تاثر قائم نہیں ہوتا۔ وقت الگ ضائع ہوتا ہے، پریشانی بھی اٹھانی پڑتی ہے۔

انسان کا ذوق کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، اٹھنے بیٹھنے، ملنے جلنے ہر چیز میں جھلکتا ہے، گھر بار، رہائش، دفتر سب اس کے ذوق اور سلیقے کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

پھوہڑ اور بد سلیقہ انسان کم ہی کم یاب نظر آئے گا، اور نفیس شخص کو کم ہی ناکام دیکھا جائے گا۔ اندر کا اطمینان بد سلیقگی میں کبھی نہیں مل سکتا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ نفاست اور سلیقے کے باب میں بھی ہمیں رہ نمائی فراہم کرتا ہے، بل کہ آپ ﷺ کی ذات مبارکہ میں نفاست کی علامت اور سلیقے کا معیار ہے، اصل میں ایمان خود نفاست اور سلیقے کا تقاضا کرتا ہے۔ ایمان کا آغاز توحید سے ہوتا ہے، توحید اللہ تعالیٰ سے غیر مشروط اور بلا شرکت غیرے تعلق کا نام ہے۔ اس ذات جلالت مآب کے بارے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علی وسلم کا فرمان ہے:

ان اللہ جمیل و یحب الجمال [۲۸]

اللہ خوب صورت ہے اور خوب صورتی کو پسند کرتا ہے۔

یہ خوب صورتی سلیقے ہی کا دوسرا نام ہے۔ ایک بار آپ صلی اللہ علی وسلم بنی سلیم سے تعلق رکھنے والے ایک صحابی حضرت بسر رضی اللہ عنہ کے گھر گئے، وہاں آپ کے لیے کھانے کا اہتمام تھا، کھانے کے بعد مشروب اور کھجوریں پیش کی گئیں، مشروب پی کر آپ ﷺ نے کھجوریں کھانے شروع کیں اور کھجور کی گٹھلیاں اپنے ہاتھوں میں ایک طرف جمع کرتے جاتے تھے۔ [۲۹]

دیکھیے آپ ﷺ سامنے برتن میں موجود کھجوریں کھاتے ہوئے گٹھلیاں اس میں نہیں ڈالتے بل کہ انہیں الگ ہاتھ میں جمع کرتے جاتے ہیں۔

۲۸۔ مسلم: ج ۱، ص ۹۲، رقم ۱۴۷

۲۹۔ ابوداؤد: رقم ۳۷۲۹۔ مسلم: رقم ۲۰۴۲/۱۴۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک اور روایت ملاحظہ کیجیے، ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برتن میں پیتے ہوئے پھونک مارنے یا اس میں سانس لینے سے منع فرمایا ہے۔ (۳۰)

ایسا کرنا بدسلیقگی بھی ہے، بے احتیاطی اور نفاست کے خلاف بھی، دیکھنے والے کو بھی اس سے کراہت محسوس ہوتی ہے۔ اس عمل میں جراثیم پھیلنے اور مشروب کے آلودہ ہونے کا خطرہ بھی ہوتا ہے، منہ سے تھوک وغیرہ کے ذریعے گندگی مشروب کا حصہ بھی بن سکتی ہے۔ کتنے ہی پہلو ہیں، جن سے احتیاط اس میں ہے کہ انسان اس عمل سے بچے۔

دیکھنے میں کتنی چھوٹی سی بات ہے، مگر اس میں باریک سا نکتہ یہ ہے کہ کوئی ہدایت چھوٹی نہیں، اگر اس میں انسانیت کا فائدہ ہے، اور ہر عمل ذرا سی احتیاط سے نفیس بن سکتا ہے اور ہماری شخصیت کو بہتر بنا سکتا ہے۔

نفاست سے رہنے والے ناکام نہیں ہوتے، وہ پریشانی میں ہوں تو بھی دیکھنے والا اچھا تاثر ہی لیتا ہے اور اس کی عزت وتوقیر ہر حالت میں برقرار رہتی ہے۔

احتیاط

انسان اپنے ذہن پر پوری گرفت نہیں رکھتا، تو دوسروں کے ذہنوں کو کیسے مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے سکتا ہے؟ پھر دنیا میں ہر طرح کے لوگ بستے ہیں، کس کس کو وہ مطمئن کر سکتا ہے، اور کس کس کے سامنے وضاحت کر سکتا ہے؟ اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ انسان اپنے عمل کو چیک کرتا رہے، اپنے عمل پر نظر رکھے کہ درست نیت سے صحیح کام کرتے ہوئے بھی کہیں کسی کے دل میں ہماری وجہ سے کوئی غلط تصور، یا غلط تاثر تو پیدا نہیں ہو رہا؟

یہ احتیاط اس لیے بھی ضروری ہے کہ انسان عملی زندگی میں دوسروں سے روابط رکھنے پر مجبور ہے، یہ روابط اگر مثبت سوچ کے ساتھ قائم رہیں گے تو معاملات میں سہولت ہوگی۔ اور اگر کہیں کسی بھی طور شخصیت کے ساتھ کوئی منفی تاثر قائم ہو گیا تو پھر وہ چھاپ زندگی بھر ساتھ رہے گی، اسے ہٹانا مشکل ہوگا، اور چھاپ لگنے کے بعد شخصیت کا منفی امیج بن جائے گا، جو معاملات میں رکاوٹ کا باعث بنے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی شخصیت کی اسی طرح حفاظت کرے، جیسے وہ خود اپنی حفاظت کرتا ہے۔

۳۰۔ ابوداؤد: رقم ۳۷۲۸۔ ابن ماجہ: رقم ۳۴۲۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غزوۂ مریسیع ایک جنگ ہے، اس موقع پر ایک غلطی فہمی پیدا ہوئی، عبداللہ ابن ابی مدینے کا رہنے والا تھا، اور اس نے دل سے اسلام قبول نہیں کیا تھا، اس نے صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور رسول اکرم ﷺ کے خلاف اور آپ کے ساتھیوں کے بارے میں منفی باتیں پھیلانا شروع کر دیں، اور ایسی گستاخانہ باتیں بھی کہہ گیا کہ کسی دور میں بھی وہ باتیں اہل حکومت واقتدار کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتیں، چوں کہ سفر کا موقع تھا، اس لیے اس نے یہ تک کہہ دیا کہ ہم مدینے پہنچ جائیں، پھر جو زیادہ عزت والا ہے، وہ دوسروں کو نکال باہر کرے گا۔[۳۱] مطلب یہ تھا کہ رسول اکرم ﷺ کو، اور پھر آپ کے ساتھ آپ کے مہاجرین صحابہ اکرام کو بھی مدینے سے نکال دیں گے۔ یہ قصہ چھپ نہیں سکتا تھا، یہ جملے رسول اللہ ﷺ تک بھی پہنچے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے مزاج کے مطابق یہ کہہ دیا کہ آپ کی اجازت ہو تو اس منافق کی گردن اڑا دوں؟ اب دیکھیے یہ شخص فتنے پھیلانے میں مصروف ہے، ریاست کے امن و استحکام کے لیے خطرہ ہے، اس کا وجود اور سرگرمیاں ریاست کے لیے خطرہ بن چکی ہیں، اور پھر ایسا پہلی بار بھی نہیں ہوا۔ مگر آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ بات پھر بھی قبول نہیں فرمائی، اور اس کی حکمت یہ بیان کی:

اسے چھوڑ دو، ورنہ لوگ یہ کہیں گے کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا ہے۔[۳۲]

یہ ایک درست عمل تھا، اس وقت کے حالات دیکھیں تو ضروری بھی تھا، مگر اس سے لوگوں کے ذہنوں میں غلط اور منفی تاثر پیدا ہونے کا خدشہ تھا، رسول اللہ ﷺ نے منع بھی فرمادیا اور اپنے منع فرمانے کی حکمت بھی بیان کر دی۔ ہماری نادانی، لاعلمی اور ناسمجھی کی وجہ سے صبح شام ہمارے عمل اور ہماری باتوں سے لوگ غلط تاثر لیتے ہیں، اور اس تاثر کو لے کر ہمارے بارے میں غلط رائے قائم کرتے ہیں، جن کے اثرات سے ہم زندگی بھر متاثر رہتے ہیں۔ اگر اپنی زندگی میں ہم صرف احتیاط کا اہتمام کرلیں اور اپنے ہر عمل پر نظر رکھیں کہ اس سے کہیں کوئی غلط پیغام تو نہیں جا رہا، تو ہم بڑی بڑی غلطیوں اور ان سے پیدا ہونے والے بڑے اور برُے اثرات سے ضرور بچ سکتے ہیں۔

۳۱۔ مسلم: رقم ۲۵۸۴

۳۲۔ بخاری: تفسیر، رقم ۴۹۰۵۔۴۹۰۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنی سوچ تقسیم ہونے سے بچایئے

انسان عام طور پر ایک ہی وقت میں دو طرح کے کام کرتا ہے، ایک وہ جو اس کے روز مرہ اور عادت کا حصہ بن جاتے ہیں، اور انہیں ادا کرنے میں زیادہ ذہنی توجہ درکار نہیں ہوتی، اس نوعیت کے دو کام بھی بہ یک وقت انجام دیے جاسکتے ہیں، مثلاً عام طور پر خصوصیت سے ناشتہ کرتے ہوئے اخبار کا مطالعہ بھی جاری رہتا ہے، شہری عام طور پر گاڑی چلاتے ہوئے ساتھ بیٹھے کسی شخص سے گفت گو بھی جاری رہتی ہے۔ دوسری نوعیت کے کام ایسے ہیں، جو ایک وقت میں ایک ہی کیا جاسکتا ہے، نہ روٹی پکاتے ہوئے کوئی خاتون اخبار کا مطالعہ کرسکتی ہیں۔ نہ پڑھانے والا شخص گفت گو کرتے ہوئے کچھ پڑھ لکھ سکتا ہے، وغیرہ۔ یہی صورت حال قوتِ فیصلہ کی بھی ہے انسان بعض اوقات ایسے دوراہے پر اپنے آپ کو محسوس کرتا ہے کہ اس کے لیے کسی ایک راستے کا انتخاب ناگزیر ہوتا ہے، مگر انسان کا مزاج اور بعض اوقات اس کا لالچ ایسے کسی ایک راستے کے انتخاب سے روک دیتا ہے، اس کا یہ یوں ڈبل مائنڈڈ ہونا اس کی کامیابی کے راستے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اس وقت انسان کے لیے فوری فیصلہ ضروری ہوتا ہے، اور اسے یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ کون سا فائدہ اٹھانا چاہیے، اور کون سا نقصان برداشت کرنا ضروری ہے، تاکہ مزید فائدے اٹھائے جاسکیں۔

ہمارے لیے اس معاملے میں بھی سیرت طیبہ سے رہ نمائی ملتی ہے۔ غزوۂ احد ایک اہم ترین غزوہ ہے۔ اس کی تفصیلات تو وقت طلب ہیں، جب مسلمانوں کو علم ہوا کہ مشرکین مکہ ان پر حملہ آور ہونے کو ہیں تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسبِ روایت صحابہ کرام سے مشورہ کیا، مشورے کے دوران بعض نوجوان صحابہ کرام کی جانب سے یہ رائے سامنے آئی کہ ہمیں باہر نکل کر ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ اس تجویز کے حق میں نہیں تھے، مگر جب آپ نے نوجوانوں کا ذوق دیکھا تو باہر نکلنے کے ارادے سے تیار ہوکر آگئے۔ اس دوران صحابہ کرام کو اندازہ ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ مدینے میں رہ کر ہی مقابلہ کرنے کا تھا، تو انہوں نے آپ سے درخواست کی کہ یہ نوجوان صحابہ کی رائے تھی، ہم آپ کی رائے کے ساتھ ہیں آپ جو فیصلہ فرمائیں گے، وہی ہمارا فیصلہ ہوگا، اور اسی پر عمل ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات قبول نہیں فرمائی اور جو فیصلہ ہوچکا تھا، اسے بردار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رکھا، اور فرمایا کہ کسی نبی کے لیے یہ بات جائز نہیں کہ وہ ہتھیار لگانے کے بعد جنگ کیے بغیر ہتھیار اتار دے۔ اب اللہ کے حکم پر روانہ ہو جاؤ۔ (۳۳)

غور طلب بات یہ ہے کہ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً یک سوئی اختیار کی، ایک فیصلہ کیا اور اس پر جم گئے، اس کے حوالے سے دوسرے تمام خیالات جھٹک دیے۔

یہی کام یابی کی کنجی ہے کہ انسان اپنی صلاحیتیں بچائے، اور یک سو ہو کر کسی کام کی تکمیل میں مصروف ہو جائے۔ مسلسل سوچتے رہنا اور کسی ایک فیصلے پر مطمئن نہ ہونا شخصیت کی ناکامی اور ناپختگی کی دلیل ہے۔

عملے کے ساتھ ہمارا رویہ

انسان ضرورتوں کی ترتیب کچھ اسی قسم کی ہے کہ کچھ افراد کو کچھ دوسرے افراد کے ماتحت کیا گیا ہے۔ یہ پورا ایک سلسلہ بھی ہے، ایک شخص کے ماتحت کچھ افراد ہیں، مگر وہ خود بھی کسی کے ماتحت ہے۔ اس لیے اس نظام میں خاص طور پر ان کے لیے یہ جاننا ضروری ہے، جو اپنے ماتحت کچھ افراد رکھتے ہیں، تاکہ وہ جان سکیں کہ ایک کام یاب زندگی کے لیے اپنے ماتحتوں کے ساتھ کیسا رویہ رکھنا چاہیے۔

اس حوالے سے صرف تین باتیں ذہن میں رہنی چاہییں۔

۱۔ ایک تو یہ کہ اگر کچھ لوگ ہمیں جواب دہ ہیں، تو خود ہم بھی کسی کو جواب دہ ہیں، یہ بات ذہن میں رہے گی تو انسان کا رویہ کبھی زیادتی پر مبنی نہیں ہو سکے گا۔

۲۔ دوسری بات یہ حقیقت کہ ان ذمے داریوں سے کوئی نہ بڑا ہوتا ہے، نہ چھوٹا، انسان کو بڑا چھوٹا تو اس کا کردار بناتا ہے، کچھ منصب انسان کو بڑا بنا دیتے ہیں، مگر اصل بڑائی یہ ہے کہ منصب پر آنے والا انسان اس منصب کی عزت بڑھا دے۔

۳۔ اور تیسری بات یہ کہ انسان کسی اور سے کام صرف جبر اور طاقت کے بل پر نہیں لے سکتا، کام ہو جائے گا، مگر معیار پیدا نہیں ہو سکے گا، معیار صرف اس صورت میں پیدا ہوگا، جب کام کرنے والا اس کام کو اپنی ذمے داری سمجھ کر کام انجام دے گا۔ یہ تو عام ملازموں کی بات تھی، جناب رسول اللہ ﷺ نے تو اس سلسلے میں اس وقت کے مروج غلاموں کو وہ مقام دیا، جو آج کوئی ملازم کو بھی دینے کا تصور نہیں کر سکتا۔

۳۳۔ ابن سعد۔ الطبقات: ج ۲، ص ۲۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ معروف صحابی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں، حضرت زید ایک معزز خاندان کے فرد تھے، مگر ڈاکوؤں نے انہیں پکڑ کر آگے فروخت کر دیا تھا، وہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ذریعے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں آزاد کر دیا اور منہ بولا بیٹا بنالیا۔

دوسری جانب حضرت زید کے والد اور دیگر اہل خانہ کو ان کے بارے میں عرصے تک علم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں؟ جب پتہ چلا تو وہ اور حضرت زید کے چچا انہیں لینے کے لئے آئے، مگر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ کا یہ رویہ اگر چہ بالکل درست تھا، مگر ان کے والد اور چچا کے لئے سخت حیران کن تھا، انہوں نے حضرت زید کا جب جواب سنا تو غصے میں کہا کہ اے زید، افسوس ہے تم پر، کیا تم غلامی کو آزادی پر اور اپنے باپ، چچا اور گھر والوں پر ترجیح دے رہے ہو؟ حضرت زیدؓ نے جواب میں فرمایا:

نعم انی قد رایت من هذا الرجل شیئا ما انا بالذی اختار علیه احدا ابدا[۴۴]

ہاں میں نے اس شخص (آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم) میں کچھ ایسی ہی خوبی دیکھی ہے کہ میں ان پر کسی کو بھی کبھی بھی ترجیح نہیں دے سکتا۔

اگر ہم اپنی زندگی کو کامیابی کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو اپنے لئے بہترین راہ عمل تصور کرتے ہیں تو ہمیں اس باب میں بھی اپنا محاسبہ کرنا ہوگا۔

اچھا گمان رکھیے

انسان کی سوچ پر پہرے نہیں بٹھائے جا سکتے، خیالات آتے ہی رہتے ہیں، مگر اچھے اور برے، مفید اور نقصان دہ، تعمیری اور تخریبی خیالات میں فرق کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اچھے، مفید اور تعمیری خیالات کو سنبھالا جاتا ہے، اور برے، نقصان دہ اور تخریبی خیالات کو ذہن اس بات کا سے جھٹک دیا جاتا

۴۴۔ ابن سعد۔ طبقات: ج ۴، ص ۴۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے، اور ایسے خیالات بار بار ذہن پر حملہ آور ہوں تو انہیں بار بار جھٹکنا پڑتا ہے، تاکہ انسانی ذہن عادی ہو جائے کہ کسے قبول کرنا ہے، اور کس خیال کو نظر انداز کرنا ہے؟

ان خیالات میں بدگمانی سرفہرست ہے۔ بدگمانی ہر ایک کے ذہن میں آتی ہے، مگر اسے روکا نہ جائے تو رفتہ رفتہ وہ ذہن میں جگہ بنالیتی ہے۔ اور یہی بات نقصان دہ ہوتی ہے، یہ عادت پختہ ہو جائے تو انسان کہیں کا نہیں رہتا، اور وہ بدگمانی اور شک کے چنگل میں پھنس کر اپنی زندگی تباہ کرلیتا ہے۔

ہجرت مدینہ کے ساتویں سال رمضان المبارک میں رسول اللہ ﷺ نے غالب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں بنو عوال اور بنو عبد ثعلبہ کی جانب ایک سریہ روانہ فرمایا، اس سریے میں لڑائی کے دوران ایک واقعہ پیش آیا کہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ ایک شخص کو قتل کرنے کے لئے آگے بڑھے تو اس نے فوراً کلمہ پڑھ لیا اور وہ اٹھا کہ لا الہ الا اللہ مگر حضرت اسامہ نے یہ سوچ کر اسے قتل کر دیا کہ وہ صرف اپنی جان بچانے کے لئے کلمہ پڑھ رہا ہے۔ اس واقعے کی اطلاع اس سفر سے واپسی پر جب رسول اللہ ﷺ کو ہوئی، تو آپ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ تم نے اس کا دل چیر کر کیوں نہ دیکھ لیا تاکہ تمہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ اپنے اس قول میں سچا ہے یا جھوٹا؟[۳۵]

اسی سے ملتا جلتا ایک واقعہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی پیش آیا، انہوں نے بھی حالت جنگ میں کلمہ گو ہونے کا دعویٰ کرنے والے چند مسلمانوں کو غلط فہمی کی بنا پر قتل کرنے کا حکم دیا، رسول خدا نبی رحمت ﷺ کو اس امر کی اطلاع پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے اللہ! میں تیرے سامنے خالد کے فعل سے مکمل برأت کا اظہار کرتا ہوں۔[۳۶]

در حقیقت ایک مسلمان ہونے کے ناتے ہم صرف ظاہری حالت کو قبول کرنے کے مکلف ہیں، کسی کے دل کی کیا کیفیات ہیں؟ اس کے قول اور عمل میں کس قدر تضاد ہے، یہ اس کا اور اس کے رب کا معاملہ ہے، ہمیں حکم یہی ہے کہ ہر معاملے میں خوش گمانی کا مظاہرہ کریں، ہر معاملے میں خوش فہمی کا اظہار کریں، مثبت پہلو سامنے رکھیں، روشن رخ کو دیکھیں اور اچھے پہلوؤں کو پھیلائیں، اور جہاں کہیں کوئی برا پہلو نظر آئے، کسی بات کے بارے میں یقین بھی ہو جائے کہ وہ غلط ہے، تب بھی اسے پھیلانے کا

۳۵۔ ابن سعد۔ الطبقات: ج ۲، ص ۹۱

۳۶۔ ایضاً: ج ۲، ص ۱۱۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حکم نہیں، صرف کسی ایسے انداز میں اسے سمجھا دیا جائے جو اسے نہ تو برا محسوس ہو، نہ اس سے اس شخص کو ناگوار خاطر ہو، اگر یہ ممکن نہ ہو تو خاموش ہو جائیں۔

اس حکم کے برعکس ہمارا زور اس پر صرف ہو رہا ہے کہ کھوج کھوج کر برائیاں تلاش کی جائیں، تلاش کر کر کے منفی پہلو اجاگر کیے جائیں، اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر تاریکیوں کو عام کیا جائے۔ حال آں کہ جب تاریکی بڑھے گی تو روشنی خود بہ خود کم ہونے لگے گی اور اندھیرا چاہے کوئی کرے، کسی کا بھی اس میں ہاتھ ہو مگر اس کا شکار سب مل کر ہوں گے، پھیلنے والے اندھیرے کو برداشت سب ہی کو کرنا ہوگا اور اس کے نقصانات سے کوئی محفوظ نہیں رہ سکتا، اس کے برعکس اگر ہر ایک اپنے حصے کی روشنی پھیلانا شروع کر دے تو تاریکی کے بادل خود بہ خود چھٹنا شروع ہو جائیں گے، جس کے نتیجے میں روشنی زیادہ قوت سے پھیلنا شروع ہو جائے گی، جس سے سب ہی فائدہ اٹھائیں گے، اپنی اپنی قسمت کے مطابق۔

یقین رکھیے

ہماری زندگی کی اہم ترین چیز "یقین" ہے۔ کوئی کام بھی یقین کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا، شک، تردد اور بے یقینی انسانی شخصیت تباہ کر دیتی ہے، ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس کا یقین اپنی ذات سے بھی اٹھ جاتا ہے۔ ایسا شخص کچھ نہیں کر سکتا۔ ناکامی اس کا مقدر ہے۔ اس لیے بے یقینی کو قریب بھی پھٹکنے نہیں دینا چاہیے، اور اس سے اپنے ذہن کو بچانا چاہیے۔ کام یاب شخص کسی صورت بے یقینی کا شکار نہیں ہو سکتا۔

سال ۱۳ نبوی کا ذکر ہے، مدینے سے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے ایک گروہ کو اپنے ہم راہ لے کر حج کی ادائیگی کے لئے روانہ ہوئے، مسلمانوں کے اس گروہ کی تعداد ۷۵ بیان کی جاتی ہے۔ ان مسلمانوں نے ایام تشریق میں آں حضرت ﷺ کے دست مبارک پر شہر سے باہر ایک گھاٹی میں بیعت کی۔ اس سے قبل ایک سال پہلے اسی گھاٹی میں انصار مدینہ کے کوئی بارہ افراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کر چکے تھے، اس بیعت کو بیعت عقبہ اولیٰ اور دوسری بیعت کو بیعت عقبہ ثانیہ کہا جاتا ہے۔

یہ نومسلم تھے، مگر ایمان کے اس قدر پختہ اور عملی طور پر اس قدر متحرک اور دینی جذبات سے آراستہ کہ انہوں نے فوراً نبی اکرم ﷺ کو مدینہ منورہ آنے کی دعوت دے دی۔ یہ دعوت کوئی رسمی دعوت نہ تھی، اس کے خطرناک مضمرات اور دور رس نتائج مرتب ہو سکتے تھے، ان خطرات سے یقیناً یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمانانِ مدینہ بھی واقف تھے، مگر ان کے ایمان کا اعجاز ملاحظہ کیجیے کہ انہوں نے کوئی سوال نہیں کیا، انہیں کوئی تردد انہیں پیش نہیں آیا، اور ہر وہ طرح کے خطرات مول لینے پر تیار ہو گئے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ اس وقت تک اگرچہ مسلمان نہیں ہوئے تھے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور اسلام کے لئے خیر خواہی کے جذبات رکھتے تھے، وہ اس ملاقات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ موجود تھے، انہوں نے ان خطرات کو محسوس کیا اور انصار مدینہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اے لوگو! تمہیں معلوم ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے ہاں محفوظ ہیں، اور ہم ان کی حفاظت کے ذمے دار ہیں، جیسا کہ تم دیکھ چکے ہو، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی قوم میں احترام اور عزت کے مقام کے حامل ہیں اور ہم ان کے حامی و مددگار ہیں، تم ان سے کوئی عہد یا اقرار لینے سے پہلے سوچ لینا، جو قدم بھی اٹھاؤ سوچ سمجھ کر اٹھاؤ اگر تم اپنا وعدہ پورا کر سکو تو بہتر ہے، ورنہ بہتر ہے کہ خاموش ہو جاؤ، اور ابھی کہہ دو تاکہ تمہیں بعد میں شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے اور دشمنوں کی عداوت کا نشانہ نہ بننا پڑے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ کہنے کو تو مختصر ہیں، مگر جن خطرات سے وہ آگاہ کر رہے ہیں وہ معمولی حیثیت نہیں رکھتے، وہ اتنے سرسری نوعیت کے نہیں جنہیں نظر انداز کیا جا سکے، مگر تاریخ ہی ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ اس قدر سخت تنبیہ، اس قدر واضح موقف کے باوجود اس وقت موجود انصار سے ایک نے بھی اپنے وعدے، اپنے اقدام اور اپنے ارادے پر کسی طرح سے پشیمانی کا اظہار نہیں کیا، اپنی رائے تبدیل نہیں کی، حتیٰ کہ اپنے موقف پر دوبارہ غور و فکر کرنے کے لئے چند لمحوں کی مہلت بھی نہیں طلب کی، بل کہ کہا تو صرف اس قدر کہ اے عباس (رضی اللہ عنہ) آپ نے جو کچھ کہا وہ ہم نے سن لیا اور سمجھ لیا۔

گویا کہ موقف میں کسی تبدیلی، رائے میں کسی ترمیم اور ارادے میں کسی طرح کی نظر ثانی کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اور پھر انہوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم نے سن لیا جو کچھ آپ نے کہا، یا رسول اللہ آپ اپنے لیے اور اللہ کے لئے ہم سے جو چاہیں عہد لے لیں، ہم حاضر ہیں۔ [۳۷]

ہمیشہ کیجیے

انسان کے مزاج پر بات ہو چکی۔ انسان جذباتی ہے۔ جذبات کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے، اس لیے انسان کے وہ کام بھی ایک سطح پر نہیں رہتے، جو وہ محض جذبات کی بنیاد پر انجام

۳۷۔ ابن ہشام: ج ۲، ص ۱۸۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیتا ہے۔ جذبات کا ایک فائدہ بھی ہے، اس کی وجہ سے انسان کچھ کام کر گذرتا ہے۔ مگر اس کا سبب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ وہ کام اس کا معمول نہیں بن پاتا۔ وہ اس کام کو اپنی زندگی کا حصہ نہیں بنا پاتا۔ کبھی کرتا ہے، کبھی نہیں کرتا۔ ہم اس معاملے میں شاید سب سے آگے ہیں۔ ہم میں ایک مزدور ایک ہفتے لگ کر کام کرتا ہے، پھر چند روز چھٹی کر لیتا ہے، نتیجہ ہے کہ دوسرے ہفتے وہ پھر خالی ہاتھ ہوتا ہے۔ کسی کی مدد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تو خوب دل کھول کر مدد کر دی جاتی ہے، پھر مزید کسی کی مدد سے ہاتھ اٹھا لیا جاتا ہے۔ یہ نہ درست رویہ ہے، نہ اس کا فائدہ ہے، اس سے انسان شخصیت بھی متاثر ہوتی ہے، اس کے بارے میں لوگوں کی رائے بھی یہی بنتی ہے کہ اس کے مزاج میں ٹھہراؤ نہیں ہے۔ اور ایسا بندہ کام یاب نہیں ہو سکتا۔ کام یابی کے لیے اس نکتے پر آنا ہوگا، "ہمیشہ کیجیے"۔

سیرت طیبہ نے اس پر بہت عمدہ روشنی ڈالی ہے۔ اس سے اسلام کے مزاج کا بھی ہمیں علم ہوتا ہے۔

عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ان سے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استفسار کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا یہ اطلاع صحیح ہے کہ تم دن بھر روزہ رکھتے ہو اور رات بھر نماز پڑھتے ہو؟ میں نے عرض کیا جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> ایسا نہ کرو، روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو (یعنی مسلسل روزے رکھنے کی بہ جائے درمیان میں وقفہ کیا کرو) نماز بھی پڑھو اور سویا بھی کرو، کیوں کہ تمھارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، تمھاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے، تمھاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور تم سے ملاقات کرنے والوں کا بھی تم پر حق ہے۔ تمھارے لئے یہی کافی ہے کہ ہر ماہ تین روزے رکھ لیا کرو، کیوں کہ تمہیں ہر نیکی کا بدلہ دس گنا ملے گا اور اس طرح تمھاری ساری عمر روزہ شمار ہوگا۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ لیکن میں نے اپنے اوپر سختی چاہی سو مجھ پر سختی کر دی گئی۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں اپنے اندر اس سے زیادہ کی قوت پاتا ہوں، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام والا روزہ رکھا کرو اور اس سے آگے نہ بڑھو۔ میں نے پوچھا کہ اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام کا روزہ کس نوعیت کا تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت داؤد علیہ السلام ایک دن چھوڑ کر ایک دن روزہ رکھا کرتے تھے۔ اسی طرح دوسری روایت میں یہ ضافہ بھی منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک ماہ میں ایک بار قرآن مجید ختم کیا کرو، مگر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ مجھ میں اس سے زیادہ کی طاقت ہے، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا پھر تین روز میں ایک قرآن ختم کیا کرو۔ راوی کہتا ہے کہ جب عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ضعیف ہو گئے تو فرمایا کرتے تھے کہ کاش میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی رخصت کو مان لیا ہوتا۔ (۳۸)

دل ہلکا کیجیے

انسان ذہنی دباؤ اور ایک حد تک ہی برداشت کر سکتا ہے، اس سے زیادہ نہیں، البتہ اس برداشت کی حد ہر انسان کی مختلف ہوتی ہے، اور ہر انسان اپنی گنجائش کے مطابق بھی یہ بوجھ برداشت کر پاتا ہے، حساس طبیعتوں میں یہ سطح بہت کم ہوتی ہے، اور اس دباؤ کے وقت انسان یا تو کوئی کام کر ہی نہیں پاتا، یا وہ جیسے تیسے کام کر تو لیتا ہے، مگر وہ اس دوران غلطیاں بہت کرتا ہے، اور اس کے کام کا معیار بھی برقرار نہیں رہتا۔

یہ دباؤ عام طور پر دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو وقتی طور پر کسی ناگوار ناپسندیدہ یا ان ہونی بات کا دباؤ، اور دوسرا مسلسل کام کی تھکاوٹ، اس کے نتیجے میں بھی ایک وقت آپ ایسا آتا ہے جب انسان کا ذہن کام کرنا چھوڑ دیتا ہے، اس وقت سے بچنے کے لیے ہی انسان کی مزاج میں تفریح کا عنصر رکھا گیا ہے، اور اس کی وجہ سے یہ لازم کیا گیا ہے کہ انسان اپنے کام کے اوقات کو تقسیم کرے، اور ہر انسانی ضرورت کی طرح اس ضرورت کا بھی شریعت نے احساس کیا ہے۔ چناں چہ تفریح کا پورا درست تصور دے کر اس کے آداب بھی بتا دیے گئے ہیں، تاکہ تفریح کو تفریح تک ہی رکھا جائے، اسے مزید کسی نقصان کا باعث نہ بنا لیا جائے۔

لیکن ذہنی دباؤ کا دوسرا پہلو نہایت اہم ہے، یعنی کسی وقتی واقعے، ناپسندیدہ یا ان ہونی بات کا اثر قبول نا، اور اس قدر کہ ذہن انسانی پر وہ بات طاری ہو جائے۔ ایسے موقع پر صرف ایک بات کام آتی ہے، وہ ہے انسان کا کسی قابل اعتماد شخصیت کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دینا، اور اپنی کیفیات اس سے بیان کر کے اپنا بوجھ ہلکا کر لینا، اپنے احساسات میں کسی کو شریک کر لینا۔ ہوتا یوں ہے کہ بعض افراد اس میں تکلف سے کام لیتے ہیں، یا اپنے احساسات میں کسی کو شریک کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ مگر اس شان کا کیا فائدہ، جو انسان کو اندر ہی اندر متاثر کر دے۔ ہر ایک کو ایک جگہ ایسی ضرور کار ہوتی ہے، جہاں وہ اپنا حال دل بیان کرے، اپنا بوجھ ہلکا کرے اور اپنے احساسات میں کسی کو شریک کر سکے۔ یہ جگہ ہم سب کو بنانی چاہیے۔ اس میں تکلف دراصل اپنے آپ کو نقصان پہچانے کا سبب ہے۔

۳۸۔ بخاری: کتاب الصیام، باب حق الجسم فی الصیام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سیرت طیبہ اس حوالے سے بھی ہماری رہ نمائی کرتی ہے۔ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آغاز کا ہی واقعہ ہے۔ پہلی وحی کے بعد آپ اپنے گھر تشریف لاتے ہیں اور اپنی کیفیات اپنی ہم راز اور رفیقۂ حیات حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے بیان کرتے ہیں۔ یہ دراصل آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے احساسات اور خیالات میں انہیں شریک کیا۔ اس واقعے کی اہمیت حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے اس پر ردِعمل بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ انہوں نے اس موقع پر تسلی آمیز لہجے میں فرمایا تھا:

> واللہ مایخزیک اللہ ابدا، انک لتصل الرحم، وتحمل الکل، وتکسب المعدوم، وتقری الضیف، وتعین علی نوائب الحق [۳۹]
>
> خدا کی قسم، اللہ آپ کو ہرگز ضائع نہیں ہونے دے گا۔ آپ بلا شبہ صلہ رحمی کرتے ہیں، لاچاروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، کم زوروں کو کما کر دیتے ہیں، مہمانوں کی میزبانی کرتے ہیں اور اہلِ حق کی اعانت کرتے ہیں۔

یہ دراصل اس بوجھ کا ذکر تھا، جو بالکل فطری تھا، اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتا ہے کہ اگر اس قرآن کریم کو ہم پہاڑ پر نازل کرتے تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ [۴۰] اس کو اٹھانے اور پہلی بار اس تجربے سے گزرنا فطری طور پر اپنے اثرات تو رکھے گا۔ ان ہی اثرات کو جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے اپنی رفیقۂ حیات حضرت خدیجہؓ سے ذکر کیا اور ہمیں اپنی زندگیوں کو کام یاب بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے ایک نکتہ عطا فرمایا کہ ایسے کسی بھی موقع پر اپنے احساسات میں کسی قریبی ہم دم و ہم راز کو شریک کر کے اپنا دل ہلکا کر لینا چاہیے۔ پھر ذہن پر بوجھ نہیں رہتا، اور پیش آمدہ حالات کا سامنا کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

نئے راستوں کی تلاش

ایک لگی بندھی زندگی عمومی انسانی مزاج کے لیے پسندیدہ ہے، اور اس میں تبدیلی ناقابل قبول۔ کسی ٹوٹے پھوٹے اور دور دراز کے راستے پر روز سفر کرنے والے کے لیے وہ راستہ قابل قبول ہے، کیوں کہ وہ اس سے مانوس ہے، مگر اس سے مختصر لیکن نیا راستہ اپنانا مشکل ہے، کیوں کہ وہ اس سے مانوس نہیں۔ اس میں کوئی حرج بھی نہیں، مگر دقت یہ ہے کہ بعض اوقات کسی نئے راستے کی تلاش ضروری

۳۹۔ بخاری: ج ۱، ص ۶، رقم ۲

۴۰۔ الحشر: ۲۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو جاتی ہے۔ یہ دنیا امکانات کا کھیل ہے۔ امکانات اس دنیا سے قیامت سے قبل ختم نہیں ہو سکتے۔ لیکن امکانات کو نظر انداز کر دینے والے کا اپنا کھیل جلد ختم ہو سکتا ہے۔

اس مسئلے میں اصل رکاوٹ انسانی رویہ ہے، انسان لگی بندھی زندگی میں ہلکی سی تبدیلی بھی پسند یا قبول نہیں کرتا۔ گو اس کی وجہ سے اسے نقصان ہی اٹھانا پڑے۔ لیکن انسان کی کام یابی اسی میں ہے کہ ہر نئے سوال اور ہر نئے پہلو میں غور کرے اور پورے اعتماد کے ساتھ غور کرے، اس میں فائدہ محسوس ہو تو اسے قبول کر لے، فائدہ محسوس نہ ہو، یا نقصان کا اندیشہ ہو تو اسے رد کر دے۔ اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔

نبی کریم ﷺ کی حیات مبارکہ سے ایسے دسیوں اشارے تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ آپ نے کسی بات کو صرف اس لیے رد نہیں کیا کہ آپ اس سے مانوس نہیں تھے، بل کہ کوئی نئی بات سامنے آئی تو اس پر غور کیا، سوچا، دیکھا، پرکھا، مناسب معلوم ہوا تو اسے قبول کر لیا۔ اس کی مثالیں لباس میں بھی ملتی ہیں، دوسری حکومتوں اور قبائل سے معاملات میں بھی ملتی ہیں، اور جنگی حکمت عملی میں بھی۔ آپ ﷺ نے جب دوسرے حکم رانوں کو خط لکھنا شروع کیے تو آپ کو مشورہ دیا گیا کہ ان پر خطوط پر اپنی مہر ضرور لگوایے، آپ نے قبول کر لیا اور اپنا انگوٹھی پر مہر بنوائی۔ جو آپ کے خطوط پر لگائی جاتی تھی۔

مدنی دور کی ابتدا میں آپ کھجور کے ایک تنے سے ٹیک لگا کر خطبہ دیتے اور خطاب فرمایا کرتے تھے۔ جب اس طرح کھڑے ہونے میں دقت محسوس ہونے لگی تو ایک صاحب کی تجویز پر منبر بنوایا گیا، جو بعد میں مسجد کا لازمی حصہ بن گیا۔ یہ بھی ایک نیا تجربہ تھا، جو، ایک مشورے کی صورت میں سامنے آیا۔

غزوۂ خندق کے نام سے ذہن خود بہ خود خندق کی طرف کرنا منتقل ہوتا ہے، یہ خندق دشمن کی کثرت دیکھتے ہوئے کھودی گئی، تاکہ دشمن مدینہ منورہ میں داخل نہ ہو سکے۔ یہ بالکل نیا کام تھا، جس سے اس خطے کا کوئی فرد واقف نہیں تھا۔ ان میں سے کسی مرحلے پر بھی کوئی تردد اور کوئی جھجک کہیں پر نظر نہیں آتی۔ مگر ایسا صرف اس وقت ہوتا ہے جب انسان کا اپنے اوپر پورا اعتماد ہو، جس قدر یہ اعتماد کم زور پڑتا جاتا ہے، اسی رفتار سے انسانی ذہن میں سوالات بڑھتے چلے جاتے ہیں، اور تحفظات میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

حوصلہ افزائی

کوئی انسان محض اپنے بل بوتے پر کام یاب نہیں ہو سکتا۔ انسانی مزاج اسے دوسروں سے ملنے اور ان سے مدد لینے پر اسے مجبور کرتا ہے۔ اس پر کئی حوالوں سے بات بھی ہو چکی ہے۔ انسان کو کام کرنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لیے افراد درکار ہوتے ہیں، اور افراد سے کام لینے کے لیے حوصلہ افزائی شرط ہے۔ حوصلہ افزائی کیا ہے؟ کسی بھی کام میں مصروف فرد اکتاہٹ کا بھی شکار ہو سکتا ہے، اور تھکاوٹ کا بھی۔ انسان کی محنت کی ایک حد ہے۔ انسان یہ حد کبھی جلد پوری کر لیتا ہے، ایسا تب ہوتا ہے، جب کام کے نتائج نظر نہیں آتے، اور جب اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ یکسانیت کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا حل صرف ایک ہے، انسان کی حوصلہ افزائی۔ انسان کام کرتے ہوئے اگر یہ محسوس کر لے کہ اس کے کام کو پذیرائی مل رہی ہے، اور اس کا کام لوگوں کی نظر میں اعتبار پا رہا ہے تو اس کی محنت کی حد بڑھ جاتی ہے، اور وہ عام حالات سے بڑھ کر کام کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی محنت نتیجہ خیز بن جاتی ہے، یوں اس کے کام کی مقدار اور معیار میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ یہ انسانی نفسیات ہے، اس کا ذہن میں رکھنا اور کام کرتے ہوئے اس پہلو کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

سیرتِ طیبہ میں اس حوالے سے بڑے دل چسپ اشارے ملتے ہیں۔ غزوۂ احد کا مرحلہ ہے، مشرکین مکہ زور دار حملوں میں مصروف ہیں، مسلمان بساط بھر مقابلہ کر رہے ہیں، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بڑے تیر انداز ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ احد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ترکش کے تیر نکال کر میرے آگے ڈال دیے اور فرمایا:

تجھ پر میرے ماں باپ فدا ہوں، خوب تیر چلاؤ۔ [۴۱]

اور ابن شداد کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ فرماتے تھے کہ میں نے (احد کے دن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سعد بن ابی وقاصؓ کے سوا کسی اور کے لیے یہ کہتے نہیں سنا کہ تجھ پر میرے ماں باپ فدا ہوں۔ [۴۲] اسی موقع پر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے بھی شجاعت اور جاں سپاری کے مظاہر دکھائے، اس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے فرمایا: جو شخص زمین پر چلتے پھرتے زندہ شہید کو دیکھنا چاہے وہ طلحہ کو دیکھ لے۔ [۴۳]

میدان عمل میں سرگرم کسی بھی شخص کے لیے یہ جملے اس کا خون بڑھانے کے لیے کافی ہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اپنے رفقا کی حوصلہ افزائی کی، ان کی محنت کو سراہا اور ان کی

۴۱۔ بخاری: ج ۳، ص ۳۲، رقم ۴۰۵۵

۴۲۔ بخاری: ج ۳، ص ۳۳، رقم ۴۰۵۸

۴۳۔ عیون الاثر: ج ۲، ص ۲۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مشقتوں اور ریاضتوں میں عملی طور پر شریک رہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس نے جاں نثار صحابہ کرام کو مزید جاں نثار بنا دیا تھا، اور یہی وہ نکتہ ہے جو ہماری قوت کار کو بھی بہتر بنا سکتا ہے، اور ہمارے جذبات کو بھی مہمیز دے سکتا ہے۔

اختتام

کام یابی کی تلاش کسے نہیں؟ مگر یہ راستہ محنت طلب ہے، اور انسان عجلت پسند، اس لیے انسان اپنی سستی اور کاہلی کے سبب جانتے بوجھتے بھی، اور بھرپور خواہش کے باوجود یہ راہ اختیار کرنے سے گریزاں رہتا ہے۔ کام اتنا مشکل نہیں، مگر استقامت چاہتا ہے، اور تھوڑی سی ہمت۔ ایک مسلمان کے لیے یہ محنت اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کی اخراوی، ہمیشہ کی، دائمی اور حتمی زندگی کی کام یابی کا مدار دنیاوی زندگی کی کام یاب تکمیل پر ہے۔ اس لیے کام یابی ہماری دینی ضرورت بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ عمل کی راہ آسان فرمائے۔ آمین

بجاہ سید المرسلین و علی آلہ و صحبہ اجمعین

© rasailojaraid.com